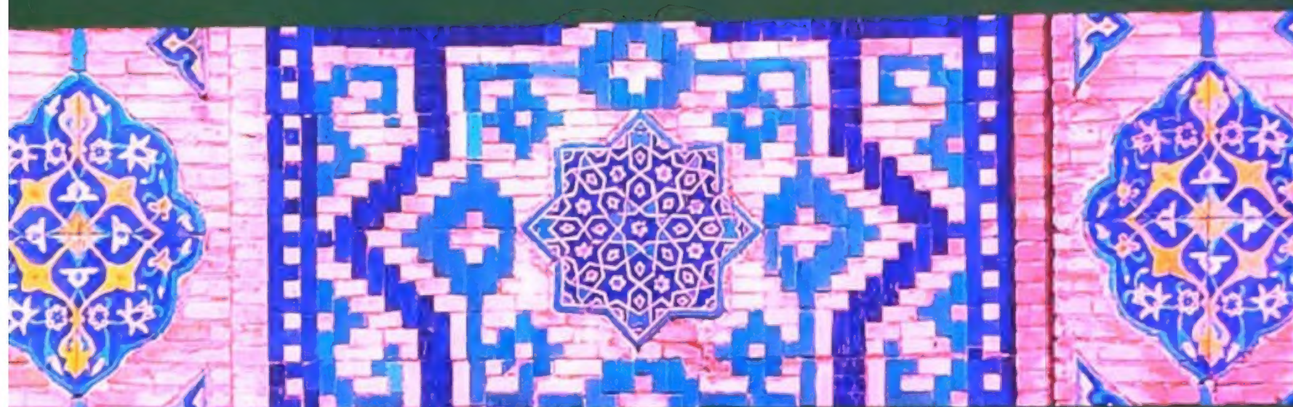
تاریخ کا سبق



مولانا وحیدالدین خاں

تاریخ کا سبق

مولانا وحید الدین خاں

تاریخ کا سبق

مولانا وحید الدین خاں

Tareekh Ka Sabaq
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1987
Fifth reprint 1996

Al-Risala Books
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128
Fax 91-11-4697333

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عروج وزوال کے تاریخی قانون کو قرآن میں مختصر طور پر اس طرح بیان کیا گیا ہے : اللہ کسی گروہ کے مابقوم (حالت قومی) کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے ما بانفس (حالت نفسی) کو نہ بدلے (انفال ۵۳، رعد ۱۱)
ان آیات میں ما بانفس کی تبدیلی سے مراد وہ تبدیلی ہے جو افراد کی سطح پر ہوتی ہے۔ کیونکہ "نفس" افراد ہی کی سطح پر پایا جاتا ہے نہ کہ اجتماع کی سطح پر۔ مطلب یہ ہے کہ قوموں کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان کے افراد میں بگاڑ آگیا ہو۔ اسی طرح قوموں کا عروج اس وقت ہوتا ہے جب کہ افراد کی سطح پر ان میں زندگی پیدا ہو جائے۔ اس سنت الٰہی کے مطابق اصلاح قوم کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اصلاح افراد سے شروع کیا جائے نہ کہ انقلاب حکومت سے۔ انقلاب حکومت کے نعرہ سے کام کا آغاز گویا کسی گروہ کے مابقوم کو مابقوم سے بدلنے کی کوشش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوشش ایک ایسی دنیا میں نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جس کے پیدا کرنے والے نے اس کے مابقوم کی تبدیلی کو اس کے ما بانفس کی تبدیلی کے ساتھ جوڑ دیا ہو۔ یہ باغ کو باغ سے نکالنے کی کوشش ہوگی۔ جب کہ اس دنیا میں باغ کو صرف بیج سے نکالا جا سکتا ہے۔

"تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ کسی نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا" ــــــ یہ قول جس طرح دوسری قوموں کے لئے صحیح ہے ٹھیک اسی طرح وہ ہمارے اوپر بھی صادق آتا ہے۔ ہماری طویل تاریخ ہر قسم کے سبق آموز واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ مگر ہم میں سے کوئی شخص جب کام کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو اکثر وہ انھیں ناکام تجربات کو دہراتا ہے جو اس سے پہلے بار بار پیش آچکے ہیں۔ وہ تاریخ کے قانون کو جانتے ہوئے اپنے آپ کو، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس سے الگ کر لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ صرف دوسروں کے لئے تھا، ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔
تاریخ مسلسل طور پر یہ سبق دیتی رہی ہے کہ کوئی قوم اس وقت ترقی کرتی ہے جب کہ اس کے افراد میں کیرکٹر کی طاقت پیدا ہو جائے۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم افراد میں کیرکٹر پیدا کئے بغیر ترقی کی طرف چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ ساری تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی سربلندی کا راز ابتدائی سطح پر تعمیر و استحکام ہے۔ مگر لوگ موقع ملتے ہی سیاسی ادارہ سے مقابلہ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ افراد قوم کے درمیان باہمی اتحاد، خواہ جس قیمت پر بھی ہو، باقی رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ مگر معمولی معمولی باتوں پر لوگ ایک دوسرے کے خلاف محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ حقیقت پسندی کسی بھی کامیابی تک پہنچنے کا واحد زینہ ہے۔ مگر ہمارے رہنما نہایت بے دردی کے ساتھ قوم کو جذباتی ہنگاموں میں مشغول کر دیتے ہیں۔ ملت کو اٹھانے کا کوئی منصوبہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ ملت کے افراد کو اٹھایا جا چکا ہو ــ ملت کی ترقی کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو بولنے سے زیادہ چپ رہنا جانتے ہوں جو الفاظ سے زیادہ معانی کی زبان سمجھتے ہوں۔ جو طاقت سے زیادہ دلیل کے آگے جھکنے والے ہوں۔ جو کہنے سے زیادہ کرنا جانتے ہوں۔ جو آگے بڑھنے سے زیادہ پیچھے ہٹنے کے بہادر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ جو دنیا سے زیادہ آخرت کو دیکھ رہے ہوں۔ ایسے افراد کے بغیر ملت کی سربلندی کا نعرہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے دلدل کے اوپر دیوار کھڑی کرنا۔

خدا کا کلمہ ان کے حق میں پورا ہو کر رہا

حضرت موسیٰ علیہ السلام (۱۴۰۰ – ۱۵۲۰ ق م) کی آمد سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے یہ واقعہ ہوا کہ فلسطین اور شام کے علاقے کے کچھ عرب، جن کو "عمالیق" کہا جاتا تھا، مصر میں داخل ہوئے اور وہاں کے مقامی حکمرانوں کے آپس کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر مصر کی سلطنت پر قابض ہو گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام (۱۷۹۶ – ۱۹۰۶ ق م) جب نوجوانی کی عمر میں فلسطین سے مصر پہنچے تو اس وقت مصر پر اُن کے اِنھیں ہم قوموں کی حکومت تھی۔ ایک عورت کی پیدا کردہ بعض ابتدائی مشکلات کے بعد آپ کو مصر میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے اور آپ کے اندر غیر معمولی انتظامی صلاحیت تھی۔ مصری حکمرانوں کو نسلی قربت کی وجہ سے آپ کی صلاحیتوں کے اعتراف میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ آپ کے زمانہ کے عرب بادشاہ ابوفیس نے آپ کے دین کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی حکومت کا تمام کاروبار آپ کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد حضرت یوسف نے اپنے والد حضرت یعقوب (اسرائیل) اور دیگر اہل خاندان کو مصر بلا لیا۔ یہ لوگ تقریباً چار سو سال تک مصر کی حکومت پر چھائے رہے۔ مصر کے آئینی حکمراں اگرچہ اب بھی مشرک عمالیق تھے مگر حکومت پر عملاً بنی اسرائیل ہی کا قبضہ تھا۔

بنی اسرائیل ابتداءً جب مصر آئے تو ان کو یہاں کی انتہائی زرخیز زمینوں میں بسایا گیا اور حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب ان کے لئے مخصوص رہے۔ مگر یہ اکثریت کے اوپر اقلیت کی حکومت تھی۔ بائبل کے بیان کے مطابق یعقوب (اسرائیل) کا گھرانا جو ملک مصر منتقل ہوا، ان کی تعداد حضرت یوسف کو ملا کر ۶۸ تھی۔ توالد و تناسل نیز تبلیغ کے ذریعے دور قدیم کے ان "مسلمانوں" کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پانچ سو برس بعد جب حضرت موسیٰ نے مردم شماری کرائی تو صرف ان کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس زمانے کی مصری آبادی کے قطعی اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں، تاہم تخمینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصر کی اس زمانے کی آبادی میں بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً ۱۰ فی صد ہوگی۔

حضرت یوسف نے ۱۱۰ سال کی عمر پائی۔ آپ کے تین چار سو سال بعد مصر میں عرب حکمرانوں کے خلاف ردعمل ہوا لمبے خون خرابے کے بعد بالآخر قبطی غالب آئے۔ "بیرونی حکمرانوں کو تخت سے بے دخل کر دیا گیا اور مصر پر ایک قبطی خاندان کی حکومت قائم ہو گئی جس کے حکمرانوں نے "فرعون" کا لقب اختیار کیا۔

قبطی حکومت کے قیام کے بعد اگرچہ ڈھائی لاکھ عربوں کو مصر سے نکال دیا گیا تھا۔ تاہم بنی اسرائیل اب بھی وہاں رکھے گئے تاکہ نئے حکمرانوں کے لئے بیگار کا کام دے سکیں۔ بائبل کے الفاظ میں: "مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ اور ان کی ساری خدمت جو وہ ان سے کراتے تھے مشقت کی تھیں" خروج ۱: ۱۳-۱۴

حضرت موسیٰؑ تشریف لائے تو بنی اسرائیل اسی دورِ مشقت سے گزر رہے تھے۔ آپ نے قبطی فرعونی تہذیب کے مقابلہ میں مغلوب حیثیت اختیار کرنے کے بجائے خود ان کے اوپر اقدام کا طریقہ اختیار کیا۔ آپ نے دعوت دینی شروع کی کہ دینِ خداوندی کو اختیار کرو، ورنہ تم سب کے سب تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ یہ چیز فرعون کے غصہ میں صرف اضافہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے لئے مصر کی زندگی آپ کے آنے کے بعد تلخ تر ہوگئی۔ حتیٰ کہ اس میں مزید یہ اضافہ ہوا کہ شاہی حکم کے تحت بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے بیٹوں کو قتل کیا جانے لگا تاکہ ان کی نسل دھیرے دھیرے مصر سے ختم ہو جائے۔ قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران ۱۸۹۶ میں ایک کتبہ ملا ہے جس میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون منفتاح فخر کے ساتھ کہتا ہے "اور اسرائیل کو مٹا دیا گیا، اس کا بیج تک باقی نہیں"

اس وقت بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے شکایت کی: "آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جا رہے تھے اور اب آپ کے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں" (اعراف ـ ۱۲۹)

اس انتہائی نازک مرحلہ میں بنی اسرائیل کو جو جواب دیا گیا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ یونس ـ ۸۷

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو وحی کی کہ تم دونوں اپنی قوم کو مصر میں ٹھہراؤ اور اپنے گھروں کو مرکزِ عمل بنالو[1] اور نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دے دو

اس آیت میں جو پروگرام دیا گیا ہے، اس کو حسبِ ذیل طریقے پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جہاں ہو، وہاں جمے رہو۔ اپنے اندر خوف و انتشار کو جگہ مت دو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو حضرت مسیحؑ نے ان لفظوں میں کہا تھا: جب تک عالم بالا سے تم کو قوت کا لباس نہ ملے اس شہر میں ٹھہرے رہو (لوقا ۲۴ : ۴۹)

۲۔ اپنے گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالو، یعنی باہمی اتحاد، اندرونی استحکام، آپس کے صبر و نصیحت اور ذاتی ذرائع پر انحصار، یہ وہ چیزیں ہیں جن پر تمھیں موجودہ حالت میں اپنی توجہات کو مرتکز رکھنا چاہیے۔

۳۔ نماز قائم کرو۔ یعنی اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرو، اس کی یاد، اس سے مانگنا، اس کے آگے اپنے آپ کو بالکل جھکا دینا، ان صفات کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر پیدا کرو۔

۴۔ یہی وہ طریقِ عمل ہے جس میں تمھارے لئے دنیا و آخرت کی تمام خوش خبریاں چھپی ہوئی ہیں۔ پوری یکسوئی کے ساتھ ان کی تکمیل میں لگ جاؤ۔ اس سہ نکاتی پروگرام کو مختصر طور پر اس طرح کہہ سکتے ہیں ــــ استقامت، داخلی تعمیر، تعلق باللہ۔ اس پروگرام پر عمل کرنے کا بالآخر جو نتیجہ نکلا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

اور جو لوگ کمزور کر دیئے گئے تھے، ہم نے ان کو زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت دی ہے۔ اور تمھارے رب کا بہترین کلمہ بنی اسرائیل کے لئے پورا ہو کر رہا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو اس کی صنعتوں اور اس کے فارموں کے ساتھ مٹا کر رکھ دیا۔ اعراف ـ ۱۳۷

---

[1] تبوآ لقومکما بمصر بیوتا کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے: ساکن کنید قوم خود را بہ شہر مصر در خانہا
قبلہ کا لفظ قبلَ کا اسم نوع ہے۔ اس کا اصل مفہوم ہے "مرکزِ توجہ"۔ کہتے ہیں قبلتِ الماشیۃُ الوادی: جانور وادی کی طرف متوجہ ہوئے

ان کے ناموافق حالات نے ان کے لئے ایک نیا موافق امکان پیدا کر دیا

مادہ جب "برباد" کیا جاتا ہے تو وہ انرجی بن جاتا ہے جو مادہ کی زیادہ وسیع اور طاقت ور صورت ہے۔ یہی خدا کی اس کائنات کا عام قانون ہے۔ یہاں ہر محرومی کے اندر ہمیشہ ایک نئی یافت کا امکان چھپا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ صفتِ خاص جس کا ظہور عالم مادی میں ہوا ہے، اس کا وعدہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اہل ایمان کے لئے کیا گیا ہے۔ ان کے لئے ان کا رب ناموافق حالات میں بھی موافق پہلو پیدا کر دیتا ہے، بشرطیکہ وہ فی الواقع خدا کے ہو چکے ہوں۔ ان کی منصوبہ بندی خالص خدائی مشن کے لئے ہو نہ کہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے۔

مکہ میں جب مسلمانوں کے حالات سخت ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا: "تم لوگ حبش چلے جاؤ۔ وہاں کا بادشاہ نجاشی عیسائی ہے اور نیک نفس ہے۔ وہ تم لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا"۔ چنانچہ ۶۱۵ میں پندرہ آدمی جدہ پہنچے اور کشتیوں پر سوار ہو کر حبش چلے گئے۔ دوسری بار ۶۱۷ میں ایک سو مسلمان حبش گئے۔

بظاہر یہ ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اس کے اندر اللہ تعالےٰ نے ایک خیر کی صورت پیدا کر دی۔ مکی مسلمانوں کا حبش پہنچنا وہاں اسلام کو موضوع بحث بنانے کا سبب بن گیا۔ پیغمبر اسلام کی بعثت اور آپ کی دعوت کی خبریں حبش میں پھیلنے لگیں۔ قریش کا ایک مخالفانہ وفد حبش پہنچنے کے نتیجہ میں حضرت جعفر کو موقع ملا کہ دربار شاہی میں اسلام کی دعوت پر مفصل تقریر کر سکیں۔ اس طرح کے واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبش سے ۲۰ عیسائیوں کا ایک وفد مکہ آیا تاکہ اصل معاملہ کی تحقیق کر سکے۔

جب یہ لوگ مکہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تھے۔ وہ وہاں گئے اور آپ سے مل کر مختلف سوالات کئے اور پوچھا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ خدا نے میرے اوپر اپنا کلام اتارا ہے اور اور قرآن کی کچھ آیات پڑھ کر سنائیں۔ یہ لوگ چونکہ تعصب سے خالی تھے، قرآن سن کر بہت متاثر ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انھوں نے تصدیق کی کہ بلاشبہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔

جس وقت یہ واقعہ ہو رہا تھا، قریش کے بہت سے لوگ وہاں جمع تھے اور سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ انھیں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ جس دین کو انھوں نے

رد کر دیا ہے، اس کو باہر کے لوگ آآ کر اپنا رہے ہیں۔ حبش کے یہ لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو ابوجہل اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر ان سے راستہ میں ملا۔ اس نے ان لوگوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا: "ہمارا خیال ہے کہ تم سے زیادہ احمق قافلہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ تمھارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لئے یہاں بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کرو اور واپس جا کر اپنے ساتھیوں کو بتاؤ۔ مگر ابھی تم اس سے ملے ہی تھے کہ اپنے دین کو چھوڑ بیٹھے۔"

جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے یہ بنی اسرائیل کے علماء تھے (شعراء ۔ ۱۹۷) انھوں نے ابوجہل وغیرہ سے کوئی بحث نہیں کی۔ بلکہ صرف یہ جواب دیا: "سلام ہے بھائیو تم کو، ہم تمھارے ساتھ جہالت نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔" (ابن ہشام)

انھیں لوگوں کے بارے میں قرآن میں آیا ہے:

"جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، یہ بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے۔ ہم تو پہلے ہی سے اس کو ماننے والے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دہرا اجر دیا جائے گا، ان کے صبر کے بدلے۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انھیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ انھوں نے جب لغویات سنی تو یہ کہہ کر اس سے الگ ہو گئے: ہمارے اعمال ہمارے ساتھ اور تمھارے اعمال تمھارے ساتھ، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔"
قصص ۵۵-۵۲

ناموافق حالات میں موافق امکان کن لوگوں کے لئے ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو صبر کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ صبر یہ ہے کہ رد عمل کی نفسیات کے تحت اقدام کرنے سے پرہیز کیا جائے اور جو فیصلہ کیا جائے غیر متاثر ذہن سے سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ ایسا انسان اپنی رفتار سفر کو خدا کی رفتار سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ اس کو ان خدائی بخششوں میں حصہ ملنے لگتا ہے جو جلد بازی سے بچنے والوں کے لئے مقدر ہیں۔

ایک درخت کاٹ دیا جائے تو ظاہر بیں کے لئے گویا درخت ختم ہو گیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس کی باقی ماندہ جڑوں سے نئی پتیاں نکل رہی ہیں۔ حتیٰ کہ انتظار کو طویل کیا جا سکے تو دیکھنے والا دیکھے گا کہ جہاں درخت بظاہر "ختم" ہو گیا تھا وہاں دوبارہ ایک نیا درخت کھڑا ہو گیا ہے۔ خدا کا یہی معاملہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ ہر بار جب کسی قوم یا شخص کے لئے ایک امکان ختم ہوتا ہے تو قانون قدرت کے تحت ایک دوسرے امکان کی کونپلیں اس کے لئے نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مگر جلد باز انسان صبر نہیں کرتا۔ وہ فوری نتیجہ حاصل کرنے کے شوق میں ایک الل ٹپ چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اس کی جلد بازی اس کو موقع نہیں دیتی کہ وہ نئے ابھرنے والے امکانات کو دیکھ سکے اور ان کے مطابق اپنے اگلے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کے بعد ایک لاحاصل اقدامات میں اپنی قوتوں کو ضائع کرتا رہتا ہے اور اس کی نوبت ہی نہیں آتی کہ وہ اس "دوسرے" دروازہ میں داخل ہو سکے جو "پہلا" دروازہ بند ہونے کے بعد اس کے رب نے اس کے لئے کھولا تھا۔ صبر سب سے بڑا دین ہے۔ مگر بہت کم ہیں جو اس پہلو سے دیندار بننے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں

جب تاریخ کا رخ موڑ دیا گیا

قدیم عرب کے شمال اور جنوب کے زرخیز حصے اس زمانہ کی دو بڑی شہنشاہیتوں ساسانی سلطنت اور اور بازنطینی سلطنت کے قبضہ میں تھے۔ شمال میں عمارت غساسنہ اور امارت بُصری تھی۔ یہ دونوں بازنطینی سلطنت (رومیوں) کے ماتحت تھیں اور یہاں ان کی طرف سے عرب سردار حکومت کرتے تھے۔ رومی اثرات کے تحت یہاں کی اکثر آبادی مسیحی مذہب اختیار کر چکی تھی۔ عرب کے جنوب میں امارت بحرین، امارت عمان، امارت یمامہ تھی۔ یہ ریاستیں ساسانی سلطنت (ایرانیوں) کے ماتحت تھیں اور ان کے اثر سے یہاں کے باشندوں میں مجوسیت پھیلی ہوئی تھی۔

۶ ھ میں جب حدیبیہ میں قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ ہوا اور حالات پرامن ہوگئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اطراف میں واقع سلطنتوں کو دعوتی مراسلے بھیجنے شروع کئے اس سلسلے میں ایک مراسلہ حارث بن ابی شمر غسانی کے نام تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر شجاع بن دھب آپ کا مراسلہ لے کر اس کے پاس گئے۔ اس مراسلہ میں یہ بھی تھا کہ اللہ پر ایمان لاؤ تمہاری حکومت باقی رہے گی (ربیقی ملکک) اس نے مکتوب نبوی میں یہ جملہ پڑھا تو اس کو غصہ آگیا۔ اس نے خط کو زمین پر پھینک دیا اور کہا: میری حکومت مجھ سے کون چھین سکتا ہے (من ینزع ملکی منی)

حاکم بُصری شرجیل بن عمرو غسانی نے اس سے بھی زیادہ بیہودہ سلوک کیا۔ اس رومی گورنر کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حارث بن عمیر ازدی آپ کا خط لے کر گئے تھے، وہ سرحد شام پر قصبہ موتہ میں داخل ہوئے تھے کہ حاکم بصری کے اشارہ پر ایک اعرابی نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا۔

بین اقوامی روایات کے مطابق یہ واقعہ ایک ملک پر دوسرے ملک کی جارحیت کے ہم معنی تھا۔ مختلف قرائن یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ شام کی فوجیں پیش قدمی کر کے مدینہ میں داخل ہو جانا چاہتی ہیں۔ رومی شہنشاہیت اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ عرب میں کوئی آزاد حکومت قائم ہو اور ترقی کرے۔

حارث بن عمیر کے قتل کی خبر مدینہ پہنچی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فوجی جواب دینا ضروری سمجھا۔ آپ نے حکم دیا کہ مسلمان اپنے ہتھیار لے کر موضع جرف میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ تین ہزار کی تعداد میں اسلامی لشکر اکٹھا ہو گیا۔ آپ نے اس لشکر پر زید بن حارثہ کو سردار مقرر کیا اور ضروری نصیحتیں کرنے کے بعد ان کو شام کی طرف روانہ کیا۔

اسلامی لشکر نے معان (شام) پہنچ کر قیام کیا۔ دوسری طرف حاکم بصری بھی جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی حوصلہ افزائی اس واقعہ سے بھی ہوئی کہ اتفاق سے ہرقل انھیں دنوں مآب (بلقاء) میں آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ مسلح فوج تھی۔ نیز اس علاقے کے عیسائی قبائل لخم، جذام، قین، بھراء، بلی بھی مسیحی حمیت کے جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بنی بلی کے سردار مالک بن زافلہ کی قیادت میں لڑنے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس طرح شامی محاذ پر ایک لاکھ سے بھی زیادہ کا لشکر جمع ہو گیا جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔

یہ جنگ جو جمادی الاولی ۸ ھ میں ہوئی، اس میں زید بن حارثہ دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اس کے بعد

جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ بھی قیادت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کا جھنڈا گر جانے سے انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس وقت لشکر اسلام کے ایک سپاہی ثابت بن اقرم نے بڑھ کر جھنڈا اٹھالیا اور بلند آواز سے کہا:

"مسلمانو! کسی ایک شخص کو امیر بنانے پر اتفاق کر لو"

مسلمان فوجیوں کی طرف سے آواز آئی رضینا بک (ہم تمہاری سرداری پر راضی ہیں) ثابت ابن اقرم نے جواب دیا: ماانا بفاعل فاتفقوا علی خالد بن الولید (میں یہ کام نہ کر سکوں گا تم لوگ خالد بن ولید کو اپنا سردار بنالو) اب آواز بلند ہوئی: ہم کو خالد بن ولید کی سرداری منظور ہے۔ یہ سنتے ہی خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رومی لشکر پر حملہ کر کے اس کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس جنگ میں دو ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

تاہم یہ جنگ فیصلہ کن طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ رومیوں کی مدد سے غساسنہ مدینہ پر چڑھ آئیں اور اس نومولود ریاست کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ذی الحجہ ۵ھ میں بنو قریظہ کے خاتمہ کے بعد جب مدینہ میں بعض معاشی مسائل پیدا ہوئے اور ازواج رسول نے اضافہ نفقہ کا مطالبہ کیا تو آپ کو بہت رنج ہوا اور آپ نے ایک مہینہ تک گھر کے اندر نہ آنے کی قسم کھالی۔ اس سلسلے میں تاریخ میں آتا ہے کہ جب ایک صحابی عمر فاروق سے ملے اور ان سے کہا: "کچھ سنا آپ نے" تو عمر فاروق کی زبان سے فوراً نکلا: "کیا غساسنہ آگئے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عنسانیوں کی طرف سے مدینے کے لئے کتنا خطرہ لاحق تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسئلہ کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ اپنی عمر کے آخری ایام میں جن امور کے لیے آپ نے شدت سے اہتمام کیا، ان میں غساسنہ یا بالفاظ دیگر رومیوں سے مقابلہ کے لئے فوج کی تیاری بھی تھی۔ آپ نے اس مقصد کے لیے ایک فوج ترتیب دی۔ اس فوج میں اگرچہ ابوبکر و عمر جیسے بڑے بڑے اصحاب تھے مگر آپ نے انتہائی دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اس لشکر کا سردار اسامہ بن زید کو مقرر کیا۔ اسامہ نہ صرف ایک بہادر نوجوان تھے بلکہ ان کے دل میں رومیوں سے انتقام کا شدید جذبہ بھی موجزن تھا۔ کیونکہ موتہ کی جنگ میں رومیوں نے ان کے والد زید بن حارثہ کو قتل کیا تھا۔

تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں یہ لشکر روانہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ عین وقت پر آپ کے اوپر مرض الموت کا غلبہ ہو گیا۔ آپ کی وفات کے بعد صدیق اکبر نے خلیفہ اول کی حیثیت سے اس لشکر کو شام کی طرف روانہ کیا۔

یہ روانگی بھی اسلامی تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آنے لگیں۔ لوگوں نے خلیفہ اول کو مشورہ دیا کہ اب جبکہ مرکز اسلام خطرہ میں پڑ گیا ہے اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی کر دیا جائے مگر صدیق اکبر کا یہ جواب لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے کافی تھا:

"اگر مجھ کو یقین ہو کہ لشکر کی روانگی کے بعد مجھ کو مدینہ میں کوئی درندہ تنہا پا کر پھاڑ ڈالے گا، تب بھی میں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی نہیں کر سکتا جس کو خود رسول اللہ نے ترتیب دیا ہو" صدیق اکبر کی یہ ایمانی جرأت کام آئی۔ اسامہ کا لشکر نہ صرف رومیوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوا بلکہ رومی شہنشاہیت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح نے مرتدین کی بھی حوصلہ شکنی کی اور

نسبتاً آسانی کے ساتھ وہ مغلوب کرلیے گئے۔

اس واقعہ میں ایک اور بہت بڑی حکمت شامل تھی، عرب قبائل ہمیشہ سے آپس میں لڑتے چلے آرہے تھے شدید اندیشہ تھا کہ اپنی قوتوں کے اظہار کا دوسرا میدان نہ پاکر وہ دوبارہ آپس میں لڑنے لگیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت عرب طاقت کو رومی شہنشاہیت سے متصادم کرکے اس کا جواب فراہم کردیا۔ اب عربوں کی جنگجو فطرت کے لیے ایک بہترین میدان مل چکا تھا۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ وہ لوگ جو اپنے ہم وطنوں کی قتل و غارتگری کے سوا کچھ نہ جانتے تھے انھوں نے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک پوری دنیا کو فتح کرڈالا۔

لجان بیگٹ گلب پاشا نے اپنی کتاب دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد میں اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عرب نامعلوم زمانے سے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ وجدل میں زندگی بسر کرنے کے عادی رہے تھے۔ یہ جنگ وجدل کسی خاص سبب کا نتیجہ نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ ان کی طرز زندگی میں داخل تھی۔ اب جبکہ وہ بحیثیت مسلمان ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے سے روک دیئے گئے تھے یہ کیسے ممکن تھا کہ فوجی ذہنیت کے قبائلی آدمیوں کو ہمیشہ کے لیے پرامن زندگی گزارنے پر مجبور کردیا جائے؟ پیغمبر اسلامؐ نے خود اس مہم کو روانہ کرکے جس نے موتہ میں شکست کھائی تھی اس سوال کا حل پیش کردیا تھا۔

۶۳۴ء کے سرما میں تین عرب کالموں نے فلسطین اور شام پر حملہ کردیا اسی اثناء میں مشرقی عرب کے قبیلوں نے جو حیرہ کی لخمی ریاست کی ضبطی کے بعد سے ایران کے دشمن بنے ہوئے تھے، فرات کی طرف پیش قدمی کرکے حیرہ پر قبضہ کرلیا۔ ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو بازنطینی (رومی) قوت نے یرموک کے میدان میں مکمل شکست کھائی اور شام کا تمام علاقہ طبریہ تک عربوں کے قبضہ میں آگیا۔ فروری ۶۳۷ء میں ایرانی فوج قادسیہ کے مقام پر جو حیرہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا مکمل طور پر تباہ کردی گئی اور قدیم عراق بشمول ایرانی دارالسلطنت مدائن جو دجلہ کے جنوب میں موجودہ بغداد کے قریب واقع تھا، عربوں کے زیر تسلط آگیا۔ ۶۴۰ء میں مصر پر حملہ ہوا اور ایک بار پھر بازنطینی حکومت شکست یاب ہوئی اور ستمبر ۶۴۲ء تک پورے مصر پر عرب قبضہ مکمل ہوگیا۔ اسی سال بچی کھچی ایرانی فوج نہاوند کے مقام پر تباہ کردی گئی اور ایرانی سلطنت کا پورے طور پر خاتمہ ہوگیا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد پہلے خلیفہ راشد رضی اللہ عنہ نے، انتہائی نازک حالات کے باوجود حضرت اسامہ کے لشکر کو رومیوں کی طرف بھیجا۔ یہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک عظیم سبق تھا: مسلمانوں کیلئے طاقت آزمائی کا میدان خارجی دنیا ہے نہ کہ داخلی دنیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ اہم ترین سبق بعد کے زمانہ میں مسلمان بھول گئے۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ میں تو یہ حال ہے کہ مسلم ممالک دو گروہوں (ترقی پسند اور قدامت پسند) میں بٹ کر ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے ہیں۔ ان کی مسلح فوجیں اپنے ہی ملکوں کو "فتح" کرنے میں مشغول ہیں، مسلم جماعتیں خود اپنے ملکوں کی حکومتوں سے نبرد آزما ہیں۔ باہر کے حریفوں سے مقابلہ کے لئے ہر ایک عاجز ہے اور اپنے بھائیوں سے لڑنے کے لئے ہر ایک بہادر بنا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اسلام کی توسیع واشاعت کا کام رک جائے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔

یہ کامیابی محض پُرجوش اقدام کا نتیجہ نہ تھی بلکہ سوچے سمجھے منصوبہ کے ذریعہ حاصل کی گئی

"بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے" اس طرح کے الفاظ نے مسلمانوں میں ناعاقبت اندیشانہ اقدام کا ذہن پیدا کیا ہے۔ حالاں کہ خود اس شعر میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ ایک سوچی سمجھی پیش قدمی تھی نہ کہ محض ایک پرجوش چھلانگ۔

۱۶ھ میں اسلامی فوج سعد بن وقاص کی قیادت میں عراق کے علاقوں کو فتح کر رہی تھی۔ بہرہ شیر کو فتح کرکے جب وہ آگے بڑھی تو سامنے دریائے دجلہ تھا اور اس کے دوسری طرف مدائن جو ایرانیوں کا ایک اہم شہر تھا اور وہاں انھوں نے زبردست قلعہ بنا رکھا تھا۔ ایرانیوں نے بہرہ شیر سے بھاگتے ہوئے دجلہ کے پل کو توڑ دیا تھا اور دور تک کوئی کشتی بھی نہ چھوڑی تھی جس سے اسلامی لشکر دریا کو عبور کر سکے۔

سعد بن ابی وقاص اگلے دن اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور یہ کہہ کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا:

نستعین باللہ ونتوکل علیہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم

ہم اللہ سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین مددگار ہے عظیم و برتر خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔

آپ کو دیکھ کر دوسروں کو بھی جرأت ہوئی اور پورا لشکر اپنے گھوڑوں کے ساتھ دریا میں تیرنے لگا۔ یہ لوگ نصف سے زیادہ دریا پار کر چکے تھے کہ ایرانی تیراندازوں نے تیروں کی بارش شروع کر دی جو دریا کے دوسرے کنارے پہلے سے موجود تھے۔

دریا میں تیرتا ہوا لشکر اس ناگہانی آفت کا خود مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر کیا چیز تھی جس نے فوج کو برباد ہونے سے بچایا۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا اور نہ محض جوش کا کرشمہ تھا۔ یہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی تھی۔ جو کچھ ہوا، وہ عین اس نقشہ کے مطابق ہوا جو پہلے سے طے کر لیا گیا تھا۔

صورت حال پیش آنے کے بعد سعد بن وقاص نے باقاعدہ مشورہ کیا۔ سعد بن وقاص جہاں نصرت الٰہی پر یقین کرتے ہوئے دریا میں کود پڑے، وہیں انھوں نے حالات کا مکمل جائزہ لے کر اس آنے والی آفت کا بھی پیشگی اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب انھوں نے گھوڑا دریا میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو لشکریوں سے فرمایا کہ "تم میں کون ایسا بہادر سردار ہے جو اپنی جمعیت کے ساتھ اس بات کا وعدہ کرے کہ وہ ہم کو دریا عبور کرنے کے وقت دشمن کے امکانی حملہ سے بچائے گا۔ عاصم بن عمرو نے اس کی ذمہ داری لی اور چھ سو تیراندازوں کی ایک جماعت لے کر دجلہ کے اس کنارے ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی ایرانی تیراندازوں نے دجلہ میں تیرتے ہوئے اسلامی لشکر پر تیر پھینکنے شروع کئے، عاصم بن عمرو کا دستہ فوراً متحرک ہو گیا۔ اس نے ایرانی تیراندازوں پر اتنی قوت کے ساتھ مسلسل تیر برسائے کہ انھیں دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا۔ کثرت سے ایرانی مجروح اور ہلاک ہونے لگے حتی کہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس درمیان میں اسلامی لشکر دریا پار کرکے دوسرے کنارے پہنچ گیا اور ایرانی لشکر پر سخت حملہ کرکے مدائن پر قبضہ کر لیا۔

کبھی پیچھے ہٹنا سب سے بڑا اقدام ہوتا ہے مگر اس کو وہی لوگ جانتے ہیں جو بڑے دل والے ہوں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ھ) کے بعد ۲۰ سال تک فتوحات اسلام کا زبردست سلسلہ جاری رہا۔ ہر مہینے کسی نہ کسی بڑے علاقہ کے فتح کی خبر آتی تھی۔ مگر تیسرے خلیفہ کی شہادت (۳۵ھ) کے ساتھ جو باہمی لڑائیاں شروع ہوئیں، انھوں نے تقریباً ۱۰ سال تک فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ وہ شخص جس نے اس بند دروازہ کو دوبارہ کھولا، وہ حضرت امام حسنؓ تھے۔ ۴۱ھ میں آپ کی خلافت سے دست برداری بظاہر میدان عمل سے واپسی کا ایک فیصلہ تھا۔ مگر اس واپسی نے اسلامی تاریخ میں اقدام و عمل کے نئے امکانات کھول دیئے۔

حسن بن علی بن ابی طالب شعبان ۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ربیع الاول ۵۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کے والد حضرت علیؓ کی شہادت ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو کوفہ میں ہوئی تو آپ کی عمر ۳۷ سال تھی۔ اس وقت صرف عراق اور ایران حضرت علیؓ کے زیر خلافت رہ گئے تھے۔ اس کے علاوہ یمن، حجاز، شام، فلسطین، مصر وغیرہ میں امیر معاویہ کی حکومت قائم تھی۔ حضرت علیؓ کے زیر خلافت علاقہ میں بھی بہت سے لوگ درپردہ آپ کے مخالف تھے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد لوگوں نے امام حسن کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی جو آپ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔

حضرت حسن نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خلافت کی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ مگر ان کے اندر چونکہ اقتدار کی ہوس نہ تھی، انھوں نے بہت جلد اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ موجودہ حالات میں ان کا خلافت پر اصرار کرنا صرف ملت کے انتشار میں اضافہ کے ہم معنی ہوگا۔ انھوں نے ایک حقیقت پسند انسان کی طرح ایک بار اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسین سے کہا تھا:

"میں جانتا ہوں کہ نبوت و خلافت دونوں ہمارے خاندان میں جمع نہیں رہ سکتیں"

اسی نزاکت کی وجہ سے آپ نے بیعت کے وقت لوگوں سے یہ اقرار لے لیا تھا کہ "میں جس سے جنگ کروں تم اس سے جنگ کروگے، میں جس سے صلح کروں تم اس سے صلح کروگے"۔

حضرت علیؓ کے بعد کوفہ کے لوگوں نے حضرت حسن کو خلیفہ بنایا۔ دوسری طرف حضرت امیر معاویہ کے لئے حضرت علی کا اس دنیا سے جانا گویا راستہ صاف ہونے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے حضرت علی کی شہادت کی خبر ملتے ہی اپنے لئے "امیر المومنین" کا لقب اختیار کر لیا اور یہ منصوبہ بنایا کہ بقیہ اسلامی علاقوں (عراق و ایران) کو بھی اپنے ماتحت کر کے اپنی حکومت کو مکمل کر لیں۔ امیر معاویہ تجدید بیعت سے فارغ ہونے کے بعد ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر دمشق سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کوفہ میں داخلہ سے پہلے انھوں نے امام حسن کو پیغام بھیجا کہ جنگ سے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے صلح کر لیں اور مجھ کو خلیفہ وقت تسلیم کر لیں۔ امام حسن کے پاس بھی اس وقت ساٹھ ہزار کا لشکر تھا جو لڑنے مرنے پر تیار تھا۔ مگر امام حسن نے مسلمانوں کو باہمی خوں ریزی سے بچانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ اپنے حق خلافت سے از خود دست بردار ہو گئے اور صرف چھ ماہ خلیفہ رہ کر امیر معاویہ کے ہاتھ کوفہ کی مسجد میں بیعت کر لی۔

امام حسن کے پرجوش حامیوں کے لئے یہ "ذلت" ناقابل برداشت تھی۔ انھوں نے اس فیصلہ کے خلاف بہت شور وغل کیا۔ آپ کو عارالمسلمین (مسلمانوں کے لئے ننگ) کا خطاب دیا، کہا کہ آپ کافر ہو گئے ہیں۔ آپ کے کپڑے نوچے، حتی کہ آپ پر تلوار سے حملہ کیا۔ مگر آپ کسی بھی حال میں مقابلہ آرائی کی سیاست اختیار کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بلکہ فرمایا:

"خلافت اگر معاویہ بن ابوسفیان کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا۔ اور اگر یہ میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا۔"

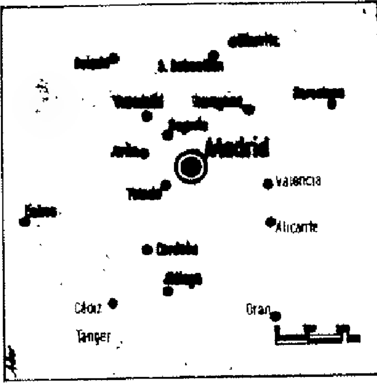
ایک شخص کے پیچھے ہٹ جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اجتماعیت میں تبدیل ہو گیا اور سال جو اسلامی تاریخ میں صفین و جمل کے بعد تیسری سب سے بڑی باہمی خوں ریزی کا عنوان بنتا، عام الجماعت کے نام سے پکارا گیا۔ وہ اختلاف کے بجائے اتحاد کا سال بن گیا۔ مسلمانوں کی قوت جو آپس کی لڑائیوں میں برباد ہوتی، اسلام کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ کبھی پیچھے ہٹنے ہی کا نام آگے بڑھنا ہوتا ہے اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

حضرت حسنؓ کا یہ عمل کسی قسم کی پسپائی یا فرار نہ تھا۔ یہ انتہائی مکمل سیاست تھی اور عین وہی چیز تھی جس کا نمونہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی سے قائم فرمایا ہے۔

اجتماعی زندگی کا معاملہ انتہائی نازک معاملہ ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اقدام اور مقابلہ کی اصطلاحوں میں سوچنا جانتا ہو تو وہ کبھی اجتماعی اصلاح کے میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی مختلف الخیال قوتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں ناقابل قیاس حد تک مختلف صورتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ اس لئے اجتماعی زندگی میں طریق عمل کا کوئی ایک معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ ضروری ہے کہ ان طاقتوں کو سمجھا جائے جو بالمقابل محاذ میں مصروف کار ہیں اور اپنی اور دوسروں کی حقیقی صورت حال کا موازنہ کرکے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ یہ کام بیک وقت نہایت گہری نگاہ کا طالب ہے اور اسی کے ساتھ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ذہن کا بھی۔ اجتماعی مقابلہ میں کبھی اپنے آپ کو مکمل طور پر نظریاتی تبلیغ کے دائرہ میں محدود رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی مثال مکہ کے ابتدائی بارہ سال ہیں۔ کبھی حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ فریق مخالف کے چیلنج کو میدان جنگ میں قبول کیا جائے۔ اس کی ایک مثال غزوۂ بدر ہے۔ کبھی دوررس نتائج کو پانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ فریق ثانی سے براہ راست تصادم کرنے سے بچا جائے خواہ اس کی قیمت یہی کیوں نہ ہو کہ فریق ثانی کے یک طرفہ مطالبات مان لینے پڑیں۔ اس کی ایک مثال معاہدۂ حدیبیہ ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں یہ سیاست کا صبر ہے۔ جو شخص سیاست میں صابرانہ طریق کار کا ہوتہ نہ رکھتا ہو اس سے اسلام کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو سیاست کے میدان میں داخل نہ کرے۔

کامیاب اقدام وہی کر سکتا ہے جو کامیاب پسپائی کا راز جانتا ہو۔ پیچھے ہٹنا بزدلی نہیں حکمت عملی ہے۔ اقتدار سے نہ ٹکرانا ظلم کو برداشت کرنا نہیں بلکہ ظلم کو جڑ سے مٹانے کی طاقت فراہم کرنا ہے۔ سیاست کو ترک کرنا سیاسی خودکشی نہیں بلکہ معاشرہ کے دیگر عوامل کو بروئے کار آنے کا موقع دینا ہے۔ احتجاج سے گریز کرنا مسئلہ سے صرف نظر کرنا نہیں بلکہ اپنی قوتوں کو مثبت تعمیر کی راہ میں لگانا ہے۔ جو شخص فوری ردعمل کے تحت سیاست کے میدان میں کود پڑتا ہے اس سے زیادہ سیاست سے ناواقف اور کوئی نہیں۔



تاریخ انسانی عمل کا ریکارڈ ہے۔ لیکن تاریخ کو اگر افسانہ بنا دیا جائے تو وہ ایک ایسا ذہنی کارخانہ بن جاتی ہے جس میں صرف خوش فہمی کی مہلک گولیاں تیار ہوتی ہوں ——

یہ ایک سوچا سمجھا ہوا منصوبہ تھا نہ کہ محض پرجوش اقدام

طارق بن زیاد رمضان ۹۱ھ میں اسپین کے ساحل پر اترے تو ان کے ساتھ سات ہزار کا لشکر تھا۔ ساحل افریقہ اور اسپین کے درمیان دس میل کی آبنائے کو ان کے لشکر نے چار کشتیوں کے ذریعہ پار کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک "مورخ اسلام" لکھتے ہیں:

"اس سے اس زمانہ کے جہازوں کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے۔"

موصوف نے قیاس کیا کہ پورا لشکر ایک ہی بار چار کشتیوں پر لد کر دوسری طرف پہنچ گیا ہوگا۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ اس زمانہ میں ایسی کشتیاں وجود میں نہیں آئی تھیں جن پر دو ہزار فوجی اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ بیک وقت بیٹھ سکیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لشکریوں نے کئی پھیروں میں آبنائے طارق کو پار کیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلمانوں نے افریقہ کو بحر روم کے آخری ساحل تک فتح کر لیا تھا۔ بازنطینی سلطنت ایشیا اور افریقہ سے ختم ہو چکی تھی۔ تاہم مراکش کے ساحل پر سبطہ اور اس کے مضافات کے علاقے اب بھی اسپینی گورنر یلیان (کاؤنٹ جولین) کے قبضہ میں تھے۔ یہاں رومیوں نے زبردست قلعہ بنایا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی طاقت دیکھ کر بالآخر انھوں نے مصلحت یہ سمجھی کہ جولین سے صلح کر لیں اور اس ساحلی قلعہ کو اس کے قبضہ میں چھوڑ دیں۔ افریقہ سے بازنطینی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جولین نے اپنے سیاسی تعلقات اسپین کی عیسائی حکومت سے قائم کر لئے۔ سبطہ اس وقت اندلس کا ایک سمندر پار صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اندلس سے برابر کشتیوں کے ذریعہ اس کو مدد پہنچتی رہتی تھی۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جو مسلمان اسپین کے ایک ماتحت گورنر سے خود اپنے مفتوحہ براعظم میں صلح کرنے پر مجبور ہوئے تھے، انھوں نے سمندر پار کر کے خود اسپین پر حملہ کرنے کی جرأت کس طرح کی۔ اس کا جواب زیر بحث مسئلہ کے تاریخی مطالعہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

۵۰۰ئ میں قوط (گاتھ) قبائل اسپین میں گھس آئے اور پانچ سو سالہ رومی سلطنت کو ختم کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ بعد کو ان لوگوں نے ٹھیک اسی طرح مسیحی مذہب کو اختیار کرلیا جس طرح ترکوں کے ایک گروہ بنو سلجوق نے مسلم دنیا پر قابض ہونے کے بعد اسلام قبول کرلیا۔ گاتھ کا مقصد اس تبدیلی مذہب سے یہ تھا کہ مقامی عیسائیوں کو مطمئن کرکے اسپین میں اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کریں۔ جس زمانہ میں مسلمانوں نے بازنطینی اقتدار کو شام، مصر، فلسطین سے ختم کیا، طلیطلہ (ٹالیڈو) پر گاتھ کا آخری بادشاہ وٹیکا (غیطشہ) حکمراں تھا۔ وٹیکا کی بعض کمزوریوں سے اس کے ایک فوجی افسر رذریق (Radrick) کو موقع ملا کہ وہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے اور خود اسپین کا حکمراں بن جائے۔

سبطہ کا گورنر جولین اگرچہ وٹیکا کا رشتہ دار تھا۔ تاہم اس نے مصلحت کے تحت اپنی وفاداریاں رذریق سے وابستہ کردیں۔ مگر بعد کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کو بے حد مشتعل کردیا۔ اور اس کو اپنے بادشاہ کا مخالف کرکے مسلمانوں کے قریب کردیا جو افریقی براعظم میں اس کے جغرافی پڑوسی تھے۔

اس زمانہ میں اسپین کا حکمراں طبقہ بدترین قسم کی عیاشیوں کا شکار تھا۔ رواج کے مطابق امراء کی لڑکیاں عرصہ تک شاہی محل میں رکھی جاتی تھیں تاکہ شاہی آداب وقواعد کو سیکھ سکیں اور بادشاہ کی خدمت کریں۔ رذریق کے عہد میں جولین کی لڑکی فلورنڈا بھی اسی رواج کے مطابق شاہی محل میں داخل ہوئی۔ لڑکی جوان ہوئی تو رذریق اس پر فریفتہ ہوگیا اور جبریہ طور پر اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو دی۔

جولین کو اس واقعہ کا انتہائی صدمہ ہوا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک رذریق کی سلطنت کو دفن نہ کرے، چین سے نہ بیٹھے گا۔ اولاً وہ طلیطلہ گیا اور لڑکی کی ماں کی بیماری کا بہانہ کرکے اس کو سبطہ واپس لایا۔ اس کے بعد وہ موسیٰ بن نصیر سے ملا اور اس کو اکسا کر تسخیر اندلس پر آمادہ کیا۔ اس نے موسیٰ کو اندلس کی اندرونی کمزوریاں بتائیں اور وعدہ کیا کہ وہ اور خود اندلس کے بہت سے لوگ اس مہم میں اسلامی فوج کا ساتھ دیں گے۔ یہ واقعہ ۹۰ ھ کا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جولین نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اپنا نام مسلم رکھا تھا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید بن عبد الملک سے خط وکتابت کی۔ کئی خطوط کے بعد ولید نے لکھا:

"مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں نہ ڈالو۔ اگر تم پر امید ہو جب بھی ابتداءً تھوڑی سی فوج بھیج کر صحیح اندازہ کرو"

موسیٰ نے رمضان ۹۱ ھ میں ایک شخص طریف کو، جس کی کنیت ابوزرعہ تھی پہلی مہم کے طور پر پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین روانہ کیا۔ جولین بھی ان کے ساتھ تھا۔ شمالی افریقہ کے ساحلی ملک مراکش اور اسپین کے درمیان صرف دس میل کا آبی فاصلہ ہے۔ ان لوگوں نے چار کشتیوں کے ذریعہ اس کو عبور کیا اور دوسری طرف ساحل پر اتر گئے۔ یہ لوگ ساحلی علاقوں میں رہے اور وہاں کے حالات کا اندازہ کرکے دوبارہ واپس آگئے۔

اس کے بعد اگلے سال رمضان ۹۲ ھ میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ دس میل کی آبنائے کو پار کرکے جب وہ لوگ اسپین کے ساحل پر اترے تو کہا جاتا ہے کہ طارق نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ مگر کشتیاں جلانے کا واقعہ بعد کا اضافہ شدہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں، اور آج بھی، فاتح

کی داستانوں میں اس قسم کے اضافے عام رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کے لئے ایک قرینہ یہ ہے کہ تاریخ اندلس کی بعض قدیم کتابوں، مثلاً "اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس" میں یہ واقعہ سرے سے مذکور نہیں ہے۔

بتایا گیا ہے کہ سمندر کو پار کر کے جب طارق بن زیاد اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنے فوجیوں کو للکارا:

ایہا الناس! العدو امامکم والبحر وراءکم ولیس لکم واللہ الا الجلد والصبر

اے لوگو دشمن تمھارے سامنے ہے اور سمندر تمھارے پیچھے ہے۔ تمھارے لئے خدا کی قسم اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ صبر کرو اور جم کر مقابلہ کرو۔

سپہ سالار کے یہ جوشیلے الفاظ سن کر لشکری چیخ اٹھے:

انا ورائک یا طارق طارق ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔

تمام تاریخوں کے متفقہ بیان کے مطابق مخالف فوجوں سے مقابلہ ساحل پر اترتے ہی فوراً پیش نہیں آیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر بعد کو اس وقت کی گئی ہے جب کہ عملاً مقابلہ پیش آیا ہے۔ اور فتح اندلس کے بعد جب تقریر کے الفاظ "سمندر تمھارے پیچھے ہے" لوگوں میں عام ہوئے تو قصہ گویوں نے اس میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ تقریر کشتیوں کو جلانے کے بعد کی گئی تھی۔ شاید ان کے نزدیک سمندر کے پیچھے ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سمندر اور فوجیوں کے درمیان سے کشتیوں کو ہٹایا جا چکا ہو!

وائرلیس کے دور سے ایک ہزار سال پہلے سمندر پار کے ملک میں اترنے والا ایک کمانڈر اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا کہ اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد یہی کشتیاں وہ واحد ذریعہ ہیں جن سے وہ اپنے مرکز سے مربوط رہ سکتا ہے۔ طارق اور موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے درمیان پیغام رسانی کا دوسرا کوئی ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ یہ صرف قیاس نہیں ہے بلکہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ، ساحل اسپین پر اترنے اور مقابلہ پیش آنے کے درمیان تقریباً دو ماہ تک، یہی کشتیاں تھیں جو دونوں کے درمیان باہمی ربط اور پیغام رسانی کا ذریعہ بنی رہیں۔

طارق جس مقام پر اترے اس کا نام قلۃ الاسد Lion's Rock تھا۔ بعد کو وہ جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوا۔ طارق اسپین کے جس ساحل پر اترے وہ اس وقت ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں ایک دشوار گزار پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر وہ لوگ اکٹھا ہو گئے، تاکہ حالات کو سمجھ کر آئندہ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسپین کا بادشاہ رذریق ان دنوں بنبلونہ (Pamplona) کی ایک جنگ میں مشغول تھا، جہاں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ اس کو جب طارق کے اسپین میں داخلہ کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ایک لاکھ فوج جمع کی جائے تاکہ مداخلت کاروں کو باہر نکالا جاسکے۔ طارق کا جاسوسی نظام بھی کام کر رہا تھا۔ انھیں جب رذریق کی تیاریوں کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنا ایک قاصد موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے یہاں روانہ کیا اور مزید کمک کی درخواست کی۔ ادھر موسیٰ بھی خاموش نہ تھے۔ بلکہ مسلسل تیاریوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ پانچ ہزار مزید سپاہی بھیج دیئے۔ اس طرح طارق کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

طارق نے پیغام رسانی کا یہ تمام کام کشتیوں کے ذریعہ کیا۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ اور پھر یہ کشتیاں ہی تھیں جنھوں نے پانچ ہزار فوجیوں کی دوسری قسط کو اسپین کے ساحل پر اتارا، جس کے بعد طارق اس قابل ہو سکے کہ وہ اسپین پر حملہ کر سکیں۔ طارق اگر اسپین کے ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیوں کو جلا دیتے تو یہ پیغام رسانی ممکن نہ ہوتی۔ اور نہ مقابلہ کے وقت مزید کمک پہنچ سکتی۔

اس معرکہ میں جولین بھی پوری طرح طارق کے ساتھ تھا۔ اس نے شاہ رذریق کے خلاف مقامی باشندوں کی ناراضگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر اسپینی شہریوں کی ایک جماعت طارق کی خدمت میں حاضر کر دی۔ ان لوگوں نے دشمن کی خبریں فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور فوجی اعتبار سے کمزور مقامات کی اطلاع مسلمانوں کو دی اور مسلمانوں کی رہبری کرتے رہے۔ یہ واقعہ بھی مسلمانوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا کہ تین سال (۰۹ - ۸۸ھ) تک اندلس میں سخت قحط پڑا تھا، اس کی وجہ سے اتنے لوگ مرے کہ کہا جاتا ہے کہ اندلس کی آبادی آدھی رہ گئی۔

مزید یہ کہ رذریق کی ایک لاکھ فوج میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جو سابق شاہ اسپین سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے باغی رذریق کا اندر اندر مخالف تھا۔ ان کے فوجی سرداروں میں ششرت اور ابتہ بھی تھے جو سابق شاہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی خفیہ میٹنگ کی اور کہا:

> "رذریق خبیث ہمارے ملک پر خواہ مخواہ مسلط ہو گیا ہے، حالاں کہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں سے ہے۔ رہے مسلمان، وہ تو صرف وقتی لوٹ مار کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے مقابلہ کے وقت اس خبیث کو زک دینے کے لئے ہم کو خود شکست کھا جانا چاہئے"

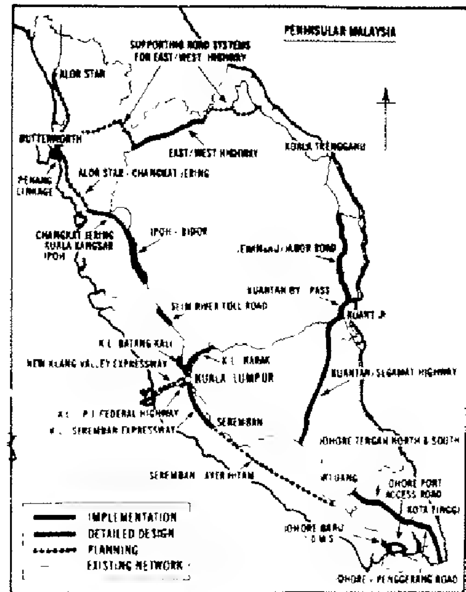
رذریق کی فوج کے ایک حصہ نے نہایت سخت جنگ کی۔ مگر غیر مطمئن فوجیوں نے جنگ میں زور نہیں دکھایا۔ بالآخر شکست ہوئی اور رذریق میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ زندہ مل سکا نہ مردہ۔ کہا جاتا ہے کہ بھاگنے کے دوران وہ ایک دلدل میں پھنس کر مر گیا۔

اسپین کے بعض علاقوں کو طارق نے فتح کیا، بعض کو مغیث رومی نے، بعض کو موسیٰ بن نصیر نے۔ جو بعد کو ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے تھے۔ رعایا کی اپنے بادشاہ اور سرداروں سے بیزاری کی وجہ سے ان کو خود اسپینیوں میں مددگار اور جاسوس ملتے چلے گئے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ غیر مسلم جاسوسوں نے اسپین کی ابتدائی فتوحات میں بہت مدد کی تھی۔

خدا کی یہ دنیا کوئی طلسماتی کارخانہ نہیں ہے۔ یہ نہایت محکم اصولوں پر قائم ہے۔ یہاں کوئی واقعہ ان قوانین سے مطابقت کرنے کے نتیجہ ہی میں ظاہر ہوتا ہے جن پر دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ جو شخص یا قوم اپنے لئے کوئی حقیقی مستقبل دیکھنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ فطرت کی اٹل بنیادوں پر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کی اس دنیا میں اس کا کوئی انجام نہیں۔ خواہ اپنے طور پر وہ اپنے بارے میں کتنا ہی زیادہ خوش فہمی میں مبتلا رہے۔

ہماری زندگی کا ایک دردناک پہلو

سابق وزیر اعظم ملیشیا تنکو عبدالرحمٰن نے بتایا کہ ملیشیا میں جو غیر مسلم آبادہیں، وہ اسلام کے بارے میں جاننے کے بہت شائق ہیں، مگر مسلمانوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ان کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ البتہ الیکشن کے موقع پر غلط قسم کی سیاست بازی کے ذریعہ وہ غیر مسلموں کو اسلام سے کچھ متوحش کر دیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی جماعت "پرکم" کی کوششوں سے ملیشیا میں تقریباً ۳۰ ہزار اور صباح میں ایک لاکھ آدمی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ سراوک میں ہر دن لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر مسلمان ان کو اپنے معاشرہ میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ ان نومسلموں سے مصافحہ تک نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق " ان کے ہاتھ سور کی چربی سے گندے



ملیشیا کی حکومت نے جزیرہ نما میں نئی سڑکوں کی تعمیر کے لئے ایک بلین ڈالر کا منصوبہ بنایا ہے۔

ہو چکے ہیں۔"

تنکو عبدالرحمٰن لکھتے ہیں :

Today I am fighting a lone battle to get these Muslim converts accepted into the Malay community.

ان نومسلموں کو ملایا کے مسلم معاشرہ میں شامل کرنے کے لئے میں ایک تنہا جنگ لڑ رہا ہوں

اسلامک ہرالڈ، کوالالمپور، دسمبر ۱۹۷۵

تنکو عبدالرحمٰن اپنی سیاسی زندگی کے زمانہ میں ملیشیا کی مقبول ترین شخصیت تھے۔ مگر جب انھوں نے سیاست کی ہنگامی زندگی کو چھوڑ کر تعمیری کام کرنا چاہا تو اب وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ تنہا ہیں۔ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔

یہی موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا حال ہے۔ وہ کسی قائد کا ساتھ صرف اس وقت دیتے ہیں جب کہ وہ ان کو جذباتی سیاست کی شراب پلا رہا ہو۔ خاموش کام کرنے والوں کا ساتھ دینے کا ان کے اندر حوصلہ نہیں۔ اس مشکل کا واحد حل یہ ہے کہ ہمارے درمیان کچھ قائد ایسے نکلیں جو عزت و شہرت کی قربانی پر اپنے آپ کو خاموش تعمیری کاموں میں لگا دیں۔ جب قائدین کی ایک نسل اس طرح اپنے آپ کو گم نامی کے قبرستان میں دفن کر چکی ہو گی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ملت کو حقیقی معنوں میں دنیا کے اندر عزت و سربلندی کا مقام حاصل ہو۔ اگر ہمارے قائدین شہرت و عزت کی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہوں اور عوام کو تعمیری کام کا وعظ سنائیں، تو یہ کام کبھی انجام نہیں پا سکتا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ تنکو عبدالرحمٰن جیسے تعمیری کام کا ذوق رکھنے والے ہمارے یہاں صرف استثنار کا درجہ رکھتے ہیں۔

اقدام سے پہلے تحقیق ضروری ہے

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۲۴ھ میں خلیفہ منتخب ہوئے اور ۳۵ھ میں آپ کو شہید کر دیا گیا جب کہ آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ امام مسلم عائشہ رضہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے مکان میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپ کی پنڈلیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ابوبکر رضہ آئے، آپ اسی حال میں لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ پھر عمر رضہ آئے۔ آپ اب بھی اسی طرح لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ اس کے بعد عثمانؓ آئے۔ اب آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے کو ٹھیک کر لیا۔ جب تینوں چلے گئے تو میں نے عرض کیا۔ اے خدا کے رسول! ابوبکر آئے مگر آپ نہیں اٹھے۔ عمر آئے پھر بھی آپ اسی طرح رہے۔ مگر عثمان آئے تو آپ اٹھ گئے اور اپنے کپڑے کو درست کر لیا۔ آپ نے فرمایا عثمان سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔

امام ترمذی عبدالرحمٰن بن خبابؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اس وقت مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا جب کہ آپ جیش عسرہ (تبوک) کی تیاری کے لئے لوگوں کو ابھار رہے تھے۔ عثمان بن عفان کھڑے ہوئے اور کہا: اے خدا کے رسول، ایک سو اونٹ مع کجاوہ اور پالان کے میں خدا کے راستہ میں دیتا ہوں"، آپؐ نے پھر لوگوں کو ابھارا۔ عثمان بن عفان دوبارہ کھڑے ہوئے اور کہا، "دو سو اونٹ معہ کجاوہ اور پالان کے اللہ کے راستہ میں"۔ آپ نے پھر لوگوں کو ابھارا۔ عثمان بن عفان تیسری بار کھڑے ہوئے اور کہا، اے خدا کے رسول تین سو اونٹ مع کجاوہ اور پالان کے اللہ کے راستہ میں" راوی کہتے ہیں، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اتر پڑے۔ اور آپ کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا:

ما علی عثمان ما عمل بعد ھٰذہ ما علی عثمان ماعمل بعد ھٰذہ — اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔ اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔

امام ترمذی انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں۔ حدیبیہ میں جب بیعت رضوان ہوئی، اس وقت عثمان بن عفان رسول اللہ کے سفیر کی حیثیت سے مکہ گئے ہوئے تھے۔ جب تمام لوگ بیعت ہو چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عثمان اس وقت اللہ اور اس کے رسول کے کام پر ہیں۔" پھر آپؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور خود اپنے ایک ہاتھ سے اپنے دوسرے ہاتھ پر عثمان کے لئے بیعت کی:

فکانت ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان خیرا من ایدیھم لانفسھم — پس عثمان کے لئے رسول اللہؐ کا ہاتھ لوگوں کے لئے ان کے اپنے ہاتھ سے بہتر تھا۔

امام ترمذی مرۃ بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کا حال بیان کیا جو آپ کے بعد آئیں گے، اتنے میں ایک صاحب سامنے سے گزرے جو کپڑا لپیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: ھذا یومئذ علی الھدی (یہ شخص اس دن حق پر ہوگا) میں اٹھ کر ان کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ وہ عثمان بن عفان ہیں۔ (ترمذی) حضرت عثمان نے اپنے مال سے مشکل وقتوں میں اتنی زیادہ اسلام کی مدد کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللّٰھم انی قد رضیت عن عثمان فارضِ عنه، اللھم انی قد رضیت عن عثمان فارض عنه

اے اللہ! میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا،
اے اللہ میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا۔

ایک بار حضرت عثمان کے ایثار و قربانی سے آپ اتنا خوش ہوئے کہ دعا کا یہ کلمہ دن بھر آپ کی زبان سے نکلتا رہا۔

تاہم یہی عثمان بن عفان تھے جن کے خلاف ان کی خلافت کے بعد کے سالوں میں سارے ممالک اسلامی میں شورش برپا ہو گئی۔ اس شورش کے پیدا کرنے میں متعدد مخلص اور مقدس لوگ بھی شریک تھے۔ یہ شورش اتنی بڑھی کہ ہزاروں کی تعداد میں بلوائی مختلف ملکوں سے جمع ہو کر مدینہ میں گھس گئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ آپ کے گھر میں پانی کا داخلہ روک دیا۔ آپ کے لئے مسجد نبوی میں جا کر نماز پڑھنا ناممکن بنا دیا۔ جب شدت بہت بڑھی تو آپ اپنے مکان کی چھت پر چڑھے اور بلوائیوں کو خطاب کیا:

عن ثُمامة بن حَزْنِ القشیری، قال شهدت الدار حین اشرف علیهم عثمان فقال: انشدکم الله والاسلام هل تعلمون ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قدم المدینة ولیس بها ماء یستعذب غیر بئر رومة۔ فقال من یشتری بئر رومة یجعل دلوه مع دلاء المسلمین بخیر له منها فی الجنة۔ فاشتریتها من صلب مالی، وانتم الیوم تمنعوننی ان اشرب منها۔ فقالوا اللّٰهم نعم۔ فقال انشدکم الله والاسلام هل تعلمون ان المسجد ضاق باهله فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم من یشتری بقعة آل فلان فیزیدها فی المسجد بخیر له منها فی الجنة فاشتریتها من صلب مالی، فانتم الیوم تمنعوننی ان اصلّی فیها رکعتین۔ فقالوا اللّٰهم نعم۔۔ قال الله اکبر، اشهدوا ورب الکعبة انی شهید، ثلاثا۔
(ترمذی۔ نسائی، دارقطنی)

ثمامہ بن حزن القشیری کہتے ہیں۔ عثمان بن عفان کے محاصرہ کے وقت میں ان کے گھر کے پاس موجود تھا۔ وہ مکان کے اوپر چڑھے اور لوگوں سے کہا۔ میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دلاتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آئے اور یہاں صرف ایک (یہودی کا) کنواں بئر رومہ تھا جس سے میٹھا پانی لیا جا سکے (وہ بہت مہنگی قیمت پر فروخت کرتا تھا) رسول اللہ نے کہا۔ کون بئر رومہ کو خریدتا ہے کہ وہ بھی اس سے پانی لے اور مسلمان بھی پانی لیں۔ جنت میں اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ میں نے (۳۵ ہزار درہم) کے عوض اس کو خریدا۔ اور تم مجھ کو اس سے پانی پینے سے روکتے ہو۔ لوگوں نے جواب دیا۔ خدایا ہاں۔ پھر عثمان بن عفان نے کہا۔ میں تم کو قسم دلاتا ہوں اللہ کی اور اسلام کی۔ کیا تم جانتے ہو کہ مسجد نبوی تنگ پڑ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون فلاں زمین کو خرید کر مسجد میں اضافہ کرتا ہے۔ جنت میں اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ میں نے اس کو اپنے مال سے خریدا۔ اور تم مجھ کو اس میں دو رکعت نماز پڑھنے سے روکتے ہو۔ لوگوں نے کہا خدایا ہاں۔ عثمان بن عفان نے کہا اللہ اکبر۔ رب کعبہ کی قسم، تم لوگ گواہ رہو کہ میں شہید ہوں

ان سب کے باوجود لوگوں نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا۔ اور قتل کرنے والے اور ان کا ساتھ دینے والے سب کے سب نماز روزہ والے تھے۔ اور اپنے کو مکمل معنوں میں مسلمان سمجھتے تھے۔

خلیفہ سوم کے خلاف اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہونے کی وجہ کیا تھی جس نے بالآخر ان کی جان لے لی۔ مورخین کے بیان کے مطابق یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے بارے میں بعض وجوہ سے عوام میں ناراضگی پائی جاتی تھی۔ اسی بیچ میں یہ واقعہ ہوا کہ مصر کے عامل عبداللہ بن ابی سرح کی زیادتیوں سے اہل مصر کو شکایت ہوئی۔ لوگ مدینہ آئے اور مطالبہ کیا کہ اس کو معزول کیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کے مشورہ سے عبداللہ بن ابی سرح کو معزول کر دیا۔ اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے لئے مصر کی امارت کا فرمان لکھ دیا۔ مصری اس فرمان کو لے کر اپنے ملک کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ محمد بن عبدالرحمٰن بھی تھے۔ راستہ میں انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان کا غلام خلیفہ کے اونٹ پر سوار ہو کر تیزی سے مصر کی طرف جا رہا ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ خلیفہ کی طرف سے ایک خط لے کر مصر کے حاکم (عبداللہ بن ابی سرح) کے پاس جا رہا ہے۔ انھوں نے زبردستی کر کے غلام سے خط چھین لیا۔ اس میں لکھا تھا کہ محمد اور ان کے ساتھی مصر پہنچیں تو ان کو قتل کر دیا جائے اور تا حکم ثانی عبداللہ بن ابی سرح مصر کا حاکم رہے۔

یہ خط حضرت عثمان کے چچا زاد بھائی مروان بن حکم نے لکھا تھا اور خلافت کی مہر لگا کر اس کو غلام کی معرفت مصر روانہ کر دیا تھا۔ مگر مصریوں نے اس کو خود خلیفہ سوم کی جانب سے سمجھا اور یہ رائے قائم کی کہ ان کے ساتھ غداری کی گئی ہے کہ ایک طرف تو عبداللہ بن ابی سرح کی معزولی کا حکم نامہ ہم کو دیا گیا اور دوسری طرف عبداللہ کو خفیہ خط روانہ کر دیا کہ ان سب لوگوں کو قتل کر دو اور تم اپنے عہدہ پر بحال رہو۔ چنانچہ وہ راستہ سے لوٹ آئے اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ دوبارہ مدینہ میں داخل ہو گئے۔ ان کا ردعمل اتنا شدید تھا کہ کسی کے سمجھانے بجھانے سے کم نہ ہو سکتا تھا۔ انھوں نے حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا اور بالآخر انھیں قتل کر ڈالا۔ اسی لئے قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی خبر ملے تو اس پر کارروائی کرنے سے پہلے خوب تحقیق کر لو:

یا یھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا	اے ایمان والو! کوئی شریر آدمی تمھارے پاس خبر لائے
ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما	تو خوب تحقیق کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کسی قوم پر
فعلتم نٰدمین (حجرات ٦)	جا پڑو پھر تم کو اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو قبیلہ بنی المصطلق کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ قبیلہ کے لوگ ان کی آمد کو سن کر ان کے استقبال کے لئے نکلے۔ ولید کی اس قبیلہ سے زمانہ جاہلیت میں کچھ شکایت تھی، وہ سمجھے کہ یہ لوگ میرے قتل کے لئے نکلے ہیں، اس لئے وہ بستی میں داخل ہونے سے پہلے مدینہ واپس آگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ قبیلہ کے لوگ میرے قتل کے درپے ہو گئے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے ارادہ کیا کہ ان کی سرکوبی کے لئے حضرت خالد کی سرکردگی میں ایک فوجی دستہ روانہ کریں۔ اسی درمیان میں قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ضرار آگئے جو ام المومنین جویریہؓ کے والد بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے زکوٰۃ جمع کر رکھی تھی مگر ولید بن عقبہ ہمارے یہاں پہنچے ہی نہیں۔ ہم تو اسلام پر قائم ہیں اور اللہ کے حقوق ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ (ابن کثیر) اس پر حکم دیا گیا کہ جب کسی کے متعلق کوئی خبر ملے تو کارروائی کرنے سے پہلے پوری تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ خبر غلط ہو اور اس کی بنا پر تم غلط اقدام کر بیٹھو۔

اختلاف کا نقصان کہاں تک جاتا ہے

عرب کے جزیرہ نما سے اسلام کا جو سیلاب اٹھا تھا، وہ اطراف کے تمام ملکوں پر اس طرح چھایا کہ ان کی زبان اور تہذیب تک بدل گئی۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ ایران کا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک اہم سوال ہے کہ وہ اسلام جس نے اپنے تمام پڑوسی ملکوں کی زبان اور تہذیب بدل دی، وہ ایران میں مذہبی تبدیلی کی حد تک کامیاب ہونے کے باوجود وہاں کی زبان کو کیوں نہ بدل سکا۔

اس سوال کا جواب ہم کو امویوں اور عباسیوں کی سیاسی لڑائی میں ملتا ہے۔ اموی خلافت کی جگہ عباسی خلافت قائم کرنے کی تحریک جو دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی۔ اس میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو سیاسی عزائم کے تحت یہ کام کر رہے تھے۔ اس گروہ کے سردار محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن مطلب تھے۔ دوسری طرف مذہبی لوگ تھے جو اصلاحی جذبہ کے تحت اس مہم میں شریک ہو گئے۔ عبداللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ محمد بن علی کے لڑکے ابراہیم ہیں جو ۱۲۴ ہجری میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اس تحریک کے "امام" مقرر ہوئے ــــ ابو مسلم خراسانی جس نے عباسی سلطنت کے قیام میں اہم حصہ ادا کیا ہے، ایک معمولی مزدور تھا جو چار جامہ سینے کا کام کرتا تھا۔ اس کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی صلاحیت کو دیکھ کر امام ابراہیم نے اس کو اپنے کام کے لئے چن لیا اور اس کو اپنا نائب مقرر کر کے خراسان بھیج دیا۔

جب عباسیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے چن چن کر بنو امیہ کے افراد کو قتل کرنا شروع کیا تاکہ مستقبل میں ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی باقی نہ رہے۔ اس زمانے میں امام ابراہیم نے ابو مسلم کو تاکید کے ساتھ لکھا کہ "خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ رکھنا۔" خراسان میں بنو امیہ کے طرف دار وہی عرب قبائل تھے جو خراسان کی فتح کے بعد وہاں جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ جو خراسانی باشندے تھے، وہ سب نو مسلم تھے اور با آسانی عباسی اقتدار کو قبول کر سکتے تھے۔ جب کہ عرب قبائل سے یہ اندیشہ تھا کہ ان کی عربیت انھیں بنو امیہ کا حامی بنا کر نئے ارباب اقتدار کے لئے مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

ابو مسلم ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے خود بھی اپنے ملک سے عربوں کے استیصال کا دل سے خواہش مند تھا۔ امام ابراہیم عباسی کی ہدایت پانے کے بعد وہ پوری طرح اس محبوب مہم کے لئے سرگرم ہو گیا۔ اس نے خراسان میں آباد سارے عرب باشندوں کا ایک طرف سے صفایا کر دیا۔ یہ عرب قبائل جو اس وقت خراسان میں آباد تھے، دوسرے پڑوسی ملکوں کی طرح یہاں کی زبان، معاشرت تمدن کو عربی بنانے میں مصروف تھے۔ ان کے مذہب کو بدلنے میں انھوں نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب زبان اور تہذیب کو بدلنے کا عمل کامیابی کے ساتھ جاری تھا، مگر ابو مسلم کی طرف سے ان کے قتل عام کے بعد یہ عمل یکا یک رک گیا۔ ایرانی زبان اور ایرانی تہذیب مرتے مرتے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ ایران و خراسان جو مصر و شام و عراق وغیرہ کی مانند آج عرب دنیا کا ایک حصہ ہوتا۔ دوبارہ فارسی ملک بن گیا۔

تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ سیاسی حوصلہ مندوں کی سیاست بازیوں کی وجہ سے ضروری قسم کے تعمیری کام ہوتے سے رک گئے جس کے نتائج بعد کو اندوہناک صورت میں برآمد ہوئے۔ چند افراد کے وقتی عزائم کی قیمت قوموں اور ملکوں کو صدیوں تک انتہائی بھیانک شکل میں دینی پڑی۔

ایک خاندانی جھگڑا جو پوری تاریخ پر چھا گیا

جنگ قادسیہ (۱۴ھ) میں جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں۔ ایرانی لشکر سے ان کا ایک مشہور پہلوان گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ اسلامی لشکر سے عاصم بن عمرو اس کے مقابلہ کے لئے باہر آئے۔ ابھی ایک دو وار ہی ہوئے تھے کہ ایرانی شہ سوار بھاگا۔ عاصم بن عمرو نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ اپنے لشکر کی صف اول کے قریب تک جا چکا تھا کہ عاصم بن عمرو پہنچ گئے۔ انھوں نے اس کے گھوڑے کی دم کو پکڑ کر اس کو روک لیا۔ سوار کو اس کے اوپر سے اٹھایا اور زبردستی اپنے گھوڑے پر اپنے آگے بٹھا لیا اور اس کے بعد گھوڑا دوڑاتے ہوئے اپنے لشکر میں آ گئے۔

اس قسم کے بہادر لوگ صفین وجمل (۳۶ھ) کی باہمی لڑائیوں میں ۹۰ ہزار کی تعداد میں کٹ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خلافت راشدہ کے آخر میں آپس کی لڑائیاں شروع نہ ہو گئی ہوتیں تو طاقت و قوت کا بے پناہ سیلاب جو عرب سے اٹھا تھا، ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تمام علاقوں کو توحید کا علاقہ بنا دیتا۔ صرف آسٹریلیا اور امریکہ ہی ممکن طور پر اس سے مستثنیٰ رہ جاتے جو وسیع سمندروں کے دوسری طرف قدیم زمانہ میں ناقابل عبور تھے۔

وہ کیا چیز تھی جس نے اس سیلاب کے رخ کو باہر کے بجائے خود اپنی طرف موڑ دیا۔ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ یہ ایک خاندانی جھگڑا تھا جس نے بڑھ کر قومی جھگڑے کی شکل اختیار کر لی اور بالآخر ساری اسلامی تاریخ پر چھا گیا۔

۲۰۷ء میں سیل عرم سے یمن میں عام تباہی آئی۔ یہاں کے باشندوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں کا رخ کیا۔ ان میں سے قبیلہ خزاعہ مکہ آیا اور حضرت اسمٰعیل (۱۹۳۴-۲۰۷۴ ق م) کی اولاد کو بے دخل کر کے مکہ پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد مقامی باشندے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ تقریباً ڈھائی سو سال تک قبیلہ خزاعہ مکہ پر قابض رہا۔ قصی بن کلاب پہلا شخص ہے جس نے قریش کی بکھری ہوئی طاقت کو دوبارہ منظم کیا اور ۴۴۰ء میں لڑ بھڑ کر خزاعہ سے مکہ کی سرداری چھین لی۔

قصی نے خانہ کعبہ کی مرمت کی۔ رفادہ، سقایہ، حجابہ اور قیادہ کے عہدے قائم کئے۔ قومی نشان کے طور پر لوار بنایا۔ قومی اسمبلی قائم کی جس کو دار الندوہ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر قصی کو تمام قبائل قریش کی سرداری حاصل ہو گئی۔

قصی کے بعد قریش کی سرداری ان کی اولاد میں جاری رہی۔ تاہم تیسری نسل میں قصی کے خاندان میں سرداری پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ قصی کا پوتا ہاشم نہایت لائق اور شاندار شخصیت کا آدمی تھا۔ اس نے تجارت کر کے نہ صرف اپنے مال میں اضافہ کیا بلکہ قریش کو بھی بین اقوامی تاجر کے مقام پر پہنچا دیا۔ اس نے اپنے بھائیوں کی مدد سے شاہ غسان، شاہ حبش، امرائے یمن اور عراق و فارس کی حکومتوں سے تجارتی معاہدے کئے اور خصوصی مراعات حاصل کیں نیز قیصر روم سے یہ پروانہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ قریش کا تجارتی مال شام و فلسطین میں بغیر کسی ٹیکس کے

داخل ہوتا رہے گا۔ اب قریش کے تجارتی قافلے گرمی کے زمانہ میں شام کی طرف جانے لگے، کیونکہ وہ ٹھنڈا اور شاداب علاقہ تھا اور جاڑے میں یمن کی طرف سفر کرنے لگے جو کہ گرم علاقہ ہے۔ (قریش - ۲) ہاشم کے حسن تدبر سے قریش کی اقتصادیات نے بہت تیزی سے ترقی کی اور نتیجۃً سارے قبیلہ میں ان کی عظمت قائم ہوگئی۔

ہاشم کی اس عزت و ترقی نے خاندان کی دوسری شاخ کے اندر ان کے خلاف منافست پیدا کر دی۔ ہاشم کے بھائی عبد شمس اور ان سے زیادہ ان کے بیٹے امیہ کو ہاشم کی سرداری ناپسند تھی۔ امیہ نے اس کو اپنے چچا سے چھیننے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے حتیٰ کہ اسی رنج و غم میں وہ ایک بار مکہ چھوڑ کر شام چلے گئے اور دس سال تک وہاں پڑے رہے۔

ہاشم کے بعد دوبارہ ان کے بیٹے عبد المطلب اپنی وجاہت و صلاحیت کی بنا پر قریش کے سردار ہوگئے اور امیہ کی اولاد اس سے محروم رہی۔ اس طرح سرداری قصی کی ہاشمی شاخ میں چلتی رہی اور اس کی اموی شاخ کو حاصل ہو سکی۔

۸ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار اصحاب کے ساتھ فتح مکہ کے لئے روانہ ہوئے تو آپ نے ایک موقع پر اپنے چچا عباسؓ سے کہا کہ ابوسفیان کو لے کر راستہ میں کسی گھاٹی پر بیٹھ جائیں تاکہ ابوسفیان، جو بدر کے بعد قریش کے سب سے بڑے لیڈر تھے، اسلامی فوج کو گزرتے ہوئے دیکھیں۔ حضرت عباس نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ ابوسفیان کو لے کر ایک تنگ پہاڑی راستہ کی طرف گئے اور وہاں بیٹھنے کے لئے کہا تو ابوسفیان کو اندیشہ ہوا۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا:

غدراً یا بنی ھاشم بنی ہاشم! کیا غداری کا ارادہ ہے۔

اس کے بعد جب دس ہزار کی تعداد میں مسلح فوج سامنے سے گزری، تو ابوسفیان پر ہیبت طاری ہوگئی۔ انھوں نے کہا:

لقد اصبح ملک ابن اخیک الغداۃ عظیما تمہارے بھتیجے کی حکومت آج بہت عظیم ہوگئی۔

خاندان عبد مناف کی ان دو شاخوں میں یہ چپقلش اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں یمن کا ایک شخص کچھ سودا لے کر مکہ آیا، ایک شخص نے اس کا سودا خریدنے کے لئے لیا اور پھر اس کو نہ قیمت دی اور نہ سودا واپس کیا وہ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر چیخنے لگا۔ یہ واقعہ عرب آن کے انتہائی خلاف تھا، چنانچہ بنو ہاشم کے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے اٹھے۔ انھوں نے آپس میں عہد کیا کہ مکہ میں اگر کسی مسافر اور اجنبی کو ستایا گیا تو وہ اس کی پوری حمایت کریں گے۔ بنو ہاشم کے ساتھ اس معاہدہ میں بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تیم بھی شریک ہوگئے۔ مگر عبد شمس کا خاندان بنو ہاشم کے خلاف اپنی جلن کی وجہ سے معاہدہ میں شریک نہیں ہوا۔

اس طرح کے واقعات جو تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں، وہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان اسی خاندانی کشمکش کے مظاہر ہیں۔

قصی بن کلاب کے خاندان کی دو شاخوں میں سرداری کی منافست جاری رہی، اکثر چھوٹے چھوٹے جھگڑے بھی ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ہاشم کے خاندان میں پیغمبر پیدا ہوگئے۔ اب اموی خاندان کی جلن اپنے شباب پر پہنچ گئی۔

پہلے انھوں نے نبوت کی مخالفت کر کے بنی ہاشم کو زیر کرنا چاہا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام مخالفین کو شکست دے کر مکہ پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ظاہر ہو گیا کہ نبوت کی مخالفت کرنا فضول ہے۔ ابوسفیانؓ، ان کے لڑکے معاویہ اور دوسرے امویوں نے اسلام قبول کرلیا۔ تاہم یہ احساس لوگوں کے اندر باقی رہا کہ نبوت کے بعد سیاسی اقتدار بنی ہاشم کے ہاتھ میں نہ جانے دیں گے۔

حضرت عمرؓ اپنے بعد علیؓ بن ابی طالب کو خلافت کے لئے موزوں ترین شخص سمجھتے تھے۔ مگر غالباً اسی اندیشہ کی بنا پر وہ آنجناب کو نامزد نہ کرسکے۔ حضرت عثمان جو خاندان امیہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے، ان کی شہادت کے بعد جب حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا گیا تو بنوامیہ کے لئے یہ بالکل ناقابل برداشت تھا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد قصاص کے مسئلہ نے ان کو فوری طور پر ایک کامیاب سیاسی حربہ دے دیا۔ اس جذباتی نعرہ پر انھوں نے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنے گرد اکھٹا کرلیا۔ اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے کہ خلیفہ چہارم کو منصب خلافت سے ہٹادیں۔ تاہم معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ نے اپنی گورنری سے فائدہ اٹھاکر مملکت اسلامی کے نصف سے زیادہ حصہ کو سیاسی طور پر کاٹ لیا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے نام پر عوام میں ایسی آگ بھڑکائی کہ کچھ لوگوں نے مجنونانہ طور پر حضرت علی کو قتل کر دیا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین جس میں ۹۰ ہزار مسلمان کٹ گئے اور دس سال کے لئے اسلام کی توسیع کا سیلاب رک گیا، وہ دراصل امویوں اور ہاشمیوں کی اسی خاندانی لڑائی کا شاخسانہ تھا جس نے پوری ملت مسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

حسن بن علی اس راز کو اچھی طرح سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوگئے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حسین بن علی کو بھی مشورہ دیا کہ خلافت کے معاملہ سے بالکل الگ ہو جائیں کیونکہ لوگ اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ نبوت اور خلافت دونوں کو علوی خاندان میں جمع ہونا برداشت کرلیں۔ مگر حضرت حسین کی رائے یہ تھی کہ حق کے لئے جان دے دینا باطل کے آگے سر جھکانے سے زیادہ بہتر ہے۔ انھوں نے خلافت کی راہ میں اپنی جان دے دی۔ یہ واقعہ ۶۱ھ کا ہے۔

اس کے بعد اموی حکومت قائم ہوگئی۔ مگر بنوامیہ کو بنوہاشم کے خلاف جو بغض وعناد تھا، وہ ان کے انتظام ملکی میں ظاہر ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ان کا ذہن یہ بن گیا کہ ہاشم کی اولاد کا خاتمہ کر دو تاکہ مستقبل میں کوئی خلافت کا دعوے دار باقی نہ رہے۔ ان وجوہ سے وہ فضا پیدا نہ ہوسکی جس میں بنوہاشم اپنی سیاسی حق تلفی کو بھول جاتے۔ اندر اندر ان کے دل میں مخالفت کی آگ سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ کے خاتمہ نے یہ دوسرا انقلاب دیکھا کہ بنوعباس نے ایرانیوں کی مدد سے بنوامیہ کا خاتمہ کر دیا۔

بنوامیہ کا فتنہ انتہائی شدید تھا۔ مگر وہ تمام تر سیاسی تھا۔ اس لئے سیاست کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر بنوہاشم سے یہ جوابی غلطی ہوئی کہ خلافت کو اپنا حق ثابت کرنے کے لئے انھوں نے خلافت کو عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا۔ اس غلطی نے ایک سیاسی قضیہ کو مذہبی حیثیت دے دی اور اس امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کہ دوسرے سیاسی

جھگڑوں کی طرح یہ جھگڑا صرف وقتی نقصان پہنچائے اور بعد کی نسلوں کے لئے محض تاریخ کا موضوع بن کر رہ جائے۔

سیاست کو مذہب بنانے کی اس غلطی نے اسلام کو جو نقصانات پہنچائے ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر وضع حدیث کا فتنہ سب سے پہلے اسی محرک کے تحت شروع ہوا۔ بے شمار حدیثیں دونوں طرف سے گھڑی گئیں ایک طرف بنوہاشم نے حضرت علی کی فضیلت میں یہ حدیث نکالی:

انا مدینۃ العلم وعلی بابہا — میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں

دوسری طرف فریق ثانی نے ایک روایت گھڑی اور کہا کہ پوری حدیث دراصل اس طرح ہے:

انا مدینۃ العلم وابوبکر اساسہا وعمر حیطانہا وعثمان سقفہا وعلی بابہا

میں علم کا شہر ہوں، ابوبکر اس کی بنیاد ہیں، عمر اس کی دیوار ہیں، عثمان اس کی چھت ہیں، علی اس کا دروازہ ہیں

اس قسم کی چیزوں سے اسلام کو جو علمی نقصان پہنچا، اس کی تلافی اب ممکن نہیں۔ تاہم یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنی رحمت خاص سے قرآن کو محفوظ کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان جھگڑوں اور ان کے پیدا کردہ فتنوں میں دین حق گم ہو جاتا اور اللہ کے بندے قیامت تک کے لئے بے آمیز سچائی کو جاننے سے محروم ہو جاتے

تاریخ کی تمام کامیابیاں باہمی اتفاق کا نتیجہ ہیں اور تاریخ کی تمام ناکامیاں باہمی اختلاف کا نتیجہ۔ انسان، خواہ ذاتی طور پر نیک اور مخلص کیوں نہ ہوں، ان میں ایک دوسرے سے شکایت پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ کسی نہ کسی وجہ سے، حتیٰ کہ بعض اوقات بلا وجہ بھی، دو افراد یا دو گروہوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اتحاد کی واحد صورت یہ ہے کہ اختلاف کو برداشت کیا جائے۔ کیونکہ اختلاف سے خالی انسانی معاشرہ اس زمین پر ممکن ہی نہیں۔ وہی لوگ کوئی بڑا کام کر سکتے ہیں جو ذاتی اعتبارات پر قومی اعتبارات کو ترجیح دے سکیں۔ جو اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھا چکے ہوں کہ اختلافی باتوں کو نظر انداز کر کے عملی اتحاد پر قائم رہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں بنتی۔ کسی دشمن کی سازش یا عداوت ان کو نقصان پہنچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔ ان کا ہر حال میں متحد رہنا ایک ایسی طاقت بن جاتا ہے جو ہر امکانی صورت حال سے نمٹنے کی یقینی ضمانت ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ ذاتی شکایتوں سے اوپر اٹھ کر سوچنا نہ جانتے ہوں، جو ذاتی اختلافات کو اجتماعی مفاد پر قربان نہ کر سکیں، وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ ان کی کوششیں یا تو محدود ہو کر رہ جاتی ہیں یا خود اپنے بھائیوں کو نقصان پہنچانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے وسائل اور مواقع کو اپنے اندرونی جھگڑوں میں برباد کرتے رہتے ہیں۔ ان کے اندر ہمیشہ ایسے کمزور گوشے باقی رہتے ہیں جہاں سے ان کا دشمن ان کے اندر گھس آئے اور ان کے بارے میں اپنے خطرناک منصوبوں کو پورا کر سکے ——— یہ اختلافی سیاست اس وقت اور زیادہ مہلک ہو جاتی ہے جب کہ اس کو عقیدہ بنا لیا جائے۔ سیاسی اختلاف کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتا ہے۔ مگر جب اس کو اعتقادی اختلاف کا درجہ دے دیا جائے تو اس کے ختم ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہاں تک کہ خدا خود ظاہر ہو کر فیصلہ فرما دے۔

دو تاریخی تجربے

سلیمان بن عبدالملک (م ۹۹ھ) کی منقبت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے خلافت راشدہ کی زریں فہرست میں پانچویں خلیفہ راشد (عمر بن عبدالعزیز) کا اضافہ کیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسی اموی حکمراں کے خانہ میں تاریخ ان واقعات کو بھی لکھتی ہے جن کا آخری نتیجہ ان دو عظیم ترین المیوں کی شکل میں برآمد ہوا جن میں سے ایک کا نام اسپین اور دوسرے کا نام ہندوستان ہے۔ اگر سلیمان بن عبدالملک، نے اسپین میں طارق کو اور ہندوستان میں محمد بن قاسم کو معتوب کر کے واپس نہ بلایا ہوتا تو شاید ان دونوں ملکوں کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو بعد کے دور میں ہمیں نظر آتی ہے۔

اسپین میں کیا ہوا

سلیمان بن عبدالملک نے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ محض ایک ذاتی شکایت کی بنا پر موسیٰ بن نصیر گورنر افریقہ اور اس کے سپہ سالار طارق بن زیاد (فاتح اسپین) کو ان کے عہدوں سے معزول کر کے واپس بلالیا۔ اور اول الذکر کو قید اور دوسرے کو نظر بند کر دیا۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر اسپین کی مسلم حکومت اور مرکز خلافت کے درمیان آغاز ہی میں حریفانہ جذبات پیدا ہو گئے۔ ۱۳۲ھ میں جب ایک خون آشام انقلاب کے بعد دمشق کی اموی سلطنت ختم ہوئی اور نئے دار الخلافہ بغداد میں عباسی خلافت قائم ہوئی تو اموی خاندان کا ایک لٹا ہوا شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل اسپین پہنچا اور وہاں کے حالات سے فائدہ اٹھا کر اسپین میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بنو امیہ کے ایک فرد کی یہ کامیابی عباسیوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس طرح اسپین اور مرکز خلافت کے درمیان رقابت کی ایک اور وجہ پیدا ہو گئی اور نتیجۃً باہمی آویزشوں کا وہ لامتناہی سلسلہ چلا جو صرف اس وقت ختم ہوا جب اسپین میں خود مسلم سلطنت ختم ہو گئی۔

مرکز خلافت اور اسپین کی یہ رقابت یہاں تک بڑھی کہ جس خلافت نے طارق بن زیاد کو بھاری کمک دے کر اسپین کی مہم پر بھیجا تھا اسی خلافت نے فرانس کے بادشاہ شارلیمین کو اکسایا کہ وہ اسپین پر حملہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین میں ایک عام خانہ جنگی اور بغاوت کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر علاقہ کا گورنر خود مختاری کا خواب دیکھنے لگا۔ امیر قرطبہ کے رشتہ داروں نے اس نازک وقت کو اسپین کے تاج و تخت کے لیے سازش کرنے کا سنہری موقع سمجھا۔ مقامی عیسائیوں کو شہ ملی کہ وہ باغی مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہر جگہ شورش پیدا کرتے رہیں۔ اسپین کی اموی خلافت کے بعد اسپین کا ملک چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں میں تقسیم ہو گیا جنھوں نے قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، بلنسیہ، طلیطلہ، مالقہ وغیرہ شہروں کو اپنا اپنا دار الحکومت بنا لیا۔

طارق بن زیاد ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں اسپین میں داخل ہوا تھا اور ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں اسپین سے مسلم

اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ آٹھ سو برس کی اس طویل مدّت کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو بغاوتوں اور شورشوں سے خالی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ اسپین کو اکثر بہت لائق مسلم حکمراں ملے۔ عدل و انصاف کے اعتبار سے بھی اور تمدن و سیاست کے اعتبار سے بھی۔ اور بلاشبہ انھوں نے مشکل حالات کے باوجود تمدن اور سیاست دانی کے اعتبار سے اسپین میں ایک عظیم تاریخ بنائی۔ مگر اندرونی حالات اور مرکز خلافت کی شہ کی بنا پر ملک کی عیسائی رعایا مسلسل بغاوتوں پر مائل رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ ماحول نہ بن سکا جس میں اس اہم ترین کام کی بنیاد پڑتی جس کے لیے اسلام نے کشور کشائی اور جہاں بانی کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ یعنی اشاعت دین کا کام۔ عرب اور اطراف عرب کے اکثر ممالک جتنی مدّت میں مکمل طور پر اسلامی آبادی کے ملک بن گئے اس سے بہت زیادہ مدت پانے کے باوجود اسپین اسلامی آبادی کا ملک نہ بن سکا۔

اسپین میں مسلم حکومت کی مثال تقریباً ویسی ہی ہے جیسے آزادی سے قبل ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی مثال۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے سو سالہ دور حکومت میں ملک کو زبردست تمدنی ترقیات سے مالا مال کیا۔ اگرچہ انھوں نے وہ غلطی نہیں کی جو اسپین کے مسلمانوں نے کی تھی۔ انھوں نے سارے ملک میں عیسائی مشنریوں کا جال بچھا دیا اور ان کو بے پناہ سہولتیں عطا کیں مگر مسیحی مذہب میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اس ملک کی آبادی کو اپنا ہم عقیدہ بنالیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہندوستان سے انگریزوں کی ہوا اکھڑی تو عالی شان عمارتیں اور بڑے بڑے پل ان کے کام نہ آسکے اور انھیں ہندوستان چھوڑ کر وطن واپس جانا پڑا۔

طارق بن زیاد نے جس اسلامی جذبے کے تحت اسپین کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اگر وہ جذبہ جاری رہتا اور وہاں مستحکم حکومت کی روایت قائم ہو گئی تو اسپین میں مسلمانوں کے سوا کسی کا وجود نہ ہوتا۔ دریا پار کرنے کے بعد اپنی طویل دعا میں اس نے رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا کی آیت بطور بد دعا نہیں دہرائی تھی۔ بلکہ یہ اپنے اس عزم کا اظہار تھا کہ وہ اس ملک کو کفر و شرک سے خالی کر کے اسلام کا گہوارہ بنا دینا چاہتا ہے۔ مسلم اسپین کی ابتدائی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مگر چند ہی برس بعد وہاں کی سیاست کا رخ اس طرح بدلا کہ تبلیغ دین کا کام پس پشت پڑ گیا۔ ۱۳۲ھ میں جب مرکز خلافت میں تبدیلی ہوئی اور بنو امیہ کی جگہ بنو عباس کی سلطنت قائم ہوئی تو اس ذہن کو مزید تقویت ملی۔ کیونکہ عباسیوں کو جتنی دلچسپی تمدن اور علوم و فنون کی ترقی سے تھی اتنی دین کی اشاعت سے نہیں تھی۔ اس طرح بغداد کے اثر سے قرطبہ تمدن اور علوم و فنون کا مرکز تو بن گیا مگر وہ اشاعت دین کا مرکز نہ بن سکا۔

چنانچہ اسپین میں جب حالات بدلے تو وہاں کی مسلم اقلیت پر عیسائی اکثریت آناً فاناً غالب آگئی اور الحمرا کا بے مثال محل مسلمانوں کے کچھ کام نہ آسکا۔ چونکہ عام آبادی میں عیسائیوں کو غلبہ حاصل تھا اس لیے ۹۰۴ھ میں قرطبہ کو زیر کرنے کے بعد جب مسلمانوں کے خلاف دار و گیر شروع ہوئی تو ان کے لیے وہاں چھپنے کی

بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ عیسائیوں نے غالب آتے ہی تمام ملک میں اپنی مذہبی عدالتیں قائم کردیں جن میں ہرروز ہزاروں مسلمان گرفتار کرکے لائے جاتے اور طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگاکر آگ میں جلادیے جاتے۔ ۹۰۴ھ میں ایک عام حکم جاری کیا گیا کہ ہر وہ شخص جو مسلمان ہے وہ دین مسیحی قبول کرلے ورنہ جہاں اس کو پایا جائے گا قتل کردیا جائے گا۔ کچھ مسلمان جہازوں پر سوار ہوکر افریقہ کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی سمندر میں غرق کردیا گیا۔ آخر کار کوئی ایک بھی توحید پرست سرزمین اسپین میں باقی نہ رہا۔ عیسائیوں نے سب کو یا تو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ یا سمندر میں ڈبودیا۔ یا آگ میں جلا ڈالا۔

۲

خلفائے اربعہ کے بعد اسلامی حکومت بنی امیہ کے ہاتھ میں چلی گئی جس کے بانی امیر معاویہ (وفات ۶۰ھ) تھے اس سلسلۂ حکومت کا پانچواں فرماں روا عبدالملک بن مروان تھا۔ ۸۶ھ میں عبدالملک کا انتقال ہوا۔ انتقال سے پہلے اس نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد مقرر کردیا۔ اس نے تمام صوبوں کے گورنروں اور عاملوں کے نام فرامین جاری کیے کہ عید الفطر کے اجتماع میں یکم شوال ۸۶ھ کو ولید و سلیمان کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی جائے۔ چنانچہ تمام ممالک اسلامی میں تاریخ مقررہ پر ان دونوں کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی گئی۔ یہی موقعہ ہے جب کہ مدینہ کے مشہور محدث سعید بن مسیب کو بیعت سے انکار کرنے پر درے لگائے گئے۔

عبدالملک بن مروان (۲۳-۸۶ھ) کے انتقال کے بعد جب اس کا بڑا لڑکا ولید تخت پر بیٹھا تو اس نے یہ کوشش شروع کی کہ اپنے بعد تخت کی وراثت اپنے بھائی (سلیمان) کے بجائے اپنے بیٹے (عبدالعزیز) کی طرف منتقل کردے۔ ولید بن عبدالملک نے پہلے اپنے بھائی سلیمان کو لکھا کہ وہ از خود ولی عہدی سے دست بردار ہوجائے۔ جب سلیمان اس کے لیے تیار نہ ہوا تو اس نے دوسری تدبیر کی۔ اس نے تمام والیان ملک اور ممتاز افراد کو اپنے حق میں ہموار کیا اور طے کیا کہ ایک روز کسی خاص اجتماع کے موقع پر تمام ممالک اسلامی میں سلیمان بن عبدالملک کی ولیعہدی کی منسوخی کا اعلان کردیا جائے اور اس کے بجائے عبدالعزیز بن ولید کی ولیعہدی پر لوگوں سے بیعت لے لی جائے۔

مگر اس منصوبہ کی تکمیل سے پہلے ۱۵ جمادی الثانی ۹۶ھ (فروری ۷۱۵ء) میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ولید بن عبدالملک کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو قدرتی طور پر وہ ان سرداروں کا دشمن ہوگیا جنھوں نے اس کو تخت سے محروم کرنے کی سازش میں اس کے بھائی ولید کا ساتھ دیا تھا۔ انھیں میں سے ایک حجاج بن یوسف تھا جو مشرق کے اسلامی ممالک کا وائسرائے تھا اور مغربی ممالک کا وائسرائے موسیٰ بن نصیر۔ حجاج کا صدر مقام عراق تھا اور موسیٰ بن نصیر کا قیروان۔ ان دونوں نے ولید کے منصوبہ کی حمایت کی تھی اس لیے دونوں سلیمان کی نظر میں اس کے بدترین دشمن تھے جن سے سب سے پہلے نمٹنا نئے حکمراں کے لیے ضروری تھا۔

حجاج، سلیمان بن عبدالملک کی تخت نشینی سے آٹھ ماہ پہلے شوال ۹۵ھ میں انتقال کرگیا تھا۔ اس لیے

سلیمان اب حجاج بن یوسف کو نہیں پا سکتا تھا۔ تاہم حجاج کے رشتے دار اس کے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے موجود تھے جن میں سرفہرست حجاج کے ابن عم اور داماد محمد بن قاسم کا نام تھا جس نے سندھ (موجودہ پاکستان) میں غیر معمولی فاتحانہ کارنامے دکھا کر حجاج کی شہرت میں اضافہ کیا تھا۔

محمد بن قاسم نہایت اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھنے والا سپہ سالار تھا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں "اس نے سندھ و ہند کی فتوحات میں ایک طرف اپنے آپ کو رستم و اسکندر سے زیادہ بڑا بہادر ثابت کیا تو دوسری طرف نوشیروان عادل سے بڑھ کر عادل و رعایا پرور ظاہر ہوا" یہ نوجوان فتح مند سردار سندھ و پنجاب میں اتنی تیزی سے گھس رہا تھا اور بستیوں کی بستیاں اس کے اثر سے اس طرح دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب سارا علاقہ ایک اسلامی علاقہ بن جائے گا۔

ہندوستان کی مہم پر محمد بن قاسم کو حجاج ہی نے روانہ کیا تھا اس کے لیے حجاج نے کتنا اہتمام کیا تھا اس کا اندازہ چند مثالوں سے ہوگا۔

۱۔ حجاج نے دیگر تمام ساز و سامان کے علاوہ ۳۰ ہزار دینار خصوصی طور پر محمد بن قاسم کے ہمراہ کیے تھے تاکہ ناگہانی ضرورت کے وقت کام آسکیں (میر معصوم) کہا جاتا ہے کہ فوج کشی کی اس مہم پر کل ۶ کروڑ درہم صرف ہوئے تھے۔

۲۔ فراہمی سامان کا حجاج کو اس قدر خیال تھا کہ اس نے سوچا کہ محمد بن قاسم کو عربوں کی عادت کی بنا پر کھانے میں سرکہ کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ اس نے بہت سی روئی سرکہ میں تر کر کے خشک کرایا اور اسے محمد بن قاسم کے پاس روانہ کیا اور لکھا کہ جب سرکہ کھانے کا جی چاہے تو اس کو پانی میں بھگو کر نچوڑ لیا کرنا۔

۳۔ پانچ منجنیقیں جو بھاری ہونے کی وجہ سے خشکی کے راستے سے روانہ نہ ہوسکتی تھیں، ایک بڑے جہاز پر لدوا کر ساحل سندھ کی طرف روانہ کیں۔ یہ منجنیقیں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کو چلانے کے پانچ سو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔

۴۔ اس پوری مہم کے دوران حجاج اور محمد بن قاسم کے درمیان ڈاک کا سلسلہ جاری رہا۔ حجاج بصرہ میں تھا اور محمد بن قاسم سندھ میں۔ مگر انتظام یہ تھا کہ ہر تیسرے روز ایک خط حجاج لکھتا تھا اور اسی طرح محمد بن قاسم بھی ساری مصروفیتوں کے باوجود ہر تیسرے روز حجاج کے نام مفصل حالات تحریر کرتا۔ ڈاک کی روانگی کے لیے ایسے خاص انتظامات کیے گئے تھے کہ اگرچہ دیبل (سندھ) اور بصرہ میں ہزاروں کوس کا فاصلہ تھا مگر برابر ساتویں روز بصرہ سے دیبل اور دیبل سے بصرہ دونوں کے خطوط پہنچ جاتے تھے۔

محمد بن قاسم نے ۹۵ھ میں ملتان فتح کیا۔ اب پورا سندھ اس کے قبضہ میں تھا۔ بحر عرب سے لے کر حدودِ کشمیر تک تمام راجاؤں اور سرداروں نے اسلام کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اب اس نے پورے برصغیر میں اسلام کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور قنوج کی طرف کوچ کرنا شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ قنوج پر قبضہ کرنے کے بعد

بقیہ علاقوں کی فتوحات کا دروازہ کھل جائے گا۔ مگر ۹۶ھ میں سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔ اس کو حجاج کے متعلقین سے حجاج کا بدلہ لینا تھا۔ اس نے ایک طرف حجاج کے بعد یزید بن مہلب کو عراق کا والی مقرر کیا اور ایک خارجی المذہب صالح بن عبدالرحمٰن کو خراج وصول کرنے کی خدمت سپرد کی۔ یہ دونوں حجاج کے بدترین دشمن تھے۔ چنانچہ سلیمان کے حکم کے مطابق ان دونوں نے نسل عقیل (خاندان حجاج) کے لوگوں کو طرح طرح سے ماخوذ کر کے قتل کرنا شروع کیا۔

دوسری طرف سلیمان نے محمد بن قاسم کو ولایت سندھ سے معزول کرنے کا حکم جاری کر دیا جس کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ حجاج بن یوسف کا ابن عم اور داماد تھا اور حجاج کا نامور عزیز ہونے کی بنا پر اس کو ہلاک کر کے سلیمان اپنے انتقامی جوش کو ٹھنڈا کر سکتا تھا۔ سلیمان نے محمد بن قاسم کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ نیا حاکم دربار خلافت کا حکم لے کر سندھ پہنچا۔ اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کیا اور مجرموں کی طرح اس کو ٹاٹ کے کپڑے پہنائے۔ ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈالیں اور معاویہ بن مہلب کی حراست میں عراق روانہ کیا۔ یہ بھی محمد بن قاسم کی سعادت مندی تھی۔ ورنہ سندھ میں وہ اتنا مقبول تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم سے بغاوت کر کے خود یزید اور مہلب کو گرفتار کر سکتا تھا۔

فتوح البلدان کے بیان کے مطابق عربی کا مشہور شعر اسی وقت محمد بن قاسم کی زبان پر جاری ہوا تھا:

اضاعونی و ای فتی اضاعوا   لیوم کریھۃ و سداد ثغر

(لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جوان کو ضائع کیا۔ وہ جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کو محفوظ رکھے)

اس کے بعد محمد بن قاسم کو دمشق لے جایا گیا۔ وہاں سلیمان کے حکم سے وہ واسط کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ اس پر داروغہ جیل کی حیثیت سے صالح بن عبدالرحمٰن مسلط تھا جس نے اس کو جیل میں طرح طرح کی تکلیفیں دے کر مار ڈالا۔

ایک مورخ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اگر ولید بن عبدالملک کی زندگی کچھ روز اور وفا کرتی۔ یا سلیمان ہی عقل و ہوش سے کام لے کر محمد بن قاسم کو چھوڑ دیتا تو شاید ایشیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔"

یہی مورخ مزید لکھتا ہے "محمد بن قاسم کے زمانہ میں خلقت خدا کثرت سے اسلام قبول کرتی جا رہی تھی۔ تبلیغ دین کی جو سچی اور صحیح کوشش اس نے چند روز میں کر کے دکھا دی۔ بعد کی بڑی بڑی سلطنتیں صدیوں میں بھی نہ کر سکیں۔ اس نوعمر سپہ سالار نے چند روز کی حکمرانی میں جو گہرا اثر ڈال دیا تھا۔ ویسا اثر پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانچ سو برس میں بھی ملک پر نہیں ڈال سکیں۔ سندھ کے علاوہ بقیہ ملک میں آج مسلمان تھوڑے ہیں اور ملک پر کوئی اثر نہیں رکھتے۔ بخلاف اس کے سندھ میں سب سے بڑا غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہے اور یہ صرف عربوں اور خاصتہً محمد بن قاسم کی دین ہے۔

تاتاری فتنہ اختلافی سیاست کا نتیجہ تھا

مسلم دنیا پر تاتاریوں کا حملہ ساتویں صدی ہجری کے ربع اول میں ہوا۔ اس وقت بغداد کی سلطنت پر ناصر لدین اللہ کا قبضہ تھا اور خراسان میں خوارزم شاہ حکومت کر رہا تھا۔ دونوں میں سیاسی اختلاف پیدا ہوگیا۔ تاتاریوں کے ہاتھ سے مسلم دنیا کی غارت گری انھیں دو مسلم قائدین کے باہمی اختلاف کے نتیجہ میں وقوع میں آئی۔ خراسان کی سلطنت اگرچہ ایک آزاد سلطنت تھی۔ تاہم وہاں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ خوارزم شاہ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ناصر لدین اللہ کی مملکت کے ایک سرحدی حصہ (عراق) کو کاٹ کر اپنے علاقہ میں شامل کرلے۔ اس نے اپنے ملک میں ناصر لدین اللہ کا خطبہ موقوف کرا دیا۔ ناصر لدین اللہ اس خبر سے بہت خفا ہوا۔ اس نے اس کے توڑ کے لئے یہ تدبیر کی کہ لڑاکو تاتاری قبائل کو اکسا کر خوارزم شاہ پر حملہ کرا دیا۔ یہ تدبیر نہ صرف خوارزم شاہ بلکہ پوری مسلم دنیا کے لئے ایک عذاب ثابت ہوئی۔ تاتاری جب خوارزم شاہ کو مغلوب کر چکے تو انھوں نے ناصر لدین اللہ کی سلطنت پر حملہ کر دیا اور بالآخر دونوں کو برباد کر ڈالا۔

خوارزم شاہ کو ۲۱ سال حکومت کرنے کا موقع ملا اور ناصر لدین اللہ کو ۴۶ سال۔ اس کے بعد دونوں میں سے ہر ایک اسی قبر میں لیٹ گیا جس میں وہ اپنے بھائی کو لٹانا چاہتا تھا —— تاریخ کا یہ سبق بھی کتنا عبرت انگیز ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر شخص جس کو موقع ملتا ہے پہلی فرصت میں اسی تاریخ کو دہراتا ہے جو خوارزم شاہ اور ناصر لدین اللہ کے واقعہ کی شکل میں ہمیشہ کے لئے ناکام ہو چکی ہے اور آخرت میں ناکام تر شکل میں سامنے آنے والی ہے۔

۱۰۹۵ سے لے کر ۱۲۷۱ء تک یورپ کی مسیحی قوموں نے بلاد اسلامیہ پر آٹھ زبردست حملے کئے۔ یہ حملے مغربی سمت سے ہوتے تھے اور ان کا مقصد "مقدس مقامات" کو عیسائی قبضہ میں لینا تھا۔ مگر دو سو سالہ جنگ اس طرح ختم ہوئی کہ بالآخر یروشلم مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا۔ اسی زمانہ میں ۱۲۲۰ء میں تاتاریوں (مغلوں) نے بلاد اسلامیہ پر حملہ کیا اور اس حد تک کامیاب ہوئے کہ سارے عالم اسلام کو زیر و زبر کر ڈالا۔ وہ چین کے شمالی پہاڑوں سے چنگیز خاں کی زیر قیادت نکلے اور ترکستان، ماوراء النہر، خراسان، آذربائیجان، اصفہان، افغانستان، فارس، عراق، شام، ایشیائے کوچک، روس، آسٹریا تک تمام ملکوں کو لوٹ مار اور قتل و غارت کا قبرستان بنا دیا۔ مورخ ابن اثیر جو اس زمانہ کا عینی شاہد ہے، اس زمانہ کے واقعات بیان کرنے بیٹھتا ہے تو اس کے قلم سے یہ الفاظ نکل جاتے ہیں:

فمن الذی یسھل علیہ ان یکتب نعی الاسلام والمسلمین؟ ومن الذی یھون ذکر ذلک؟ فیالیت امی لم تلدنی ویالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا.. فلو قال قائل ان العالم منذ خلق اللہ سبحانہ :

کون ہے جس کے لئے آسان ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہلاکت کی داستان لکھے۔ اور کون ہے جس کے لئے اس کا ذکر آسان ہو۔ کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا اور کاش میں اس سے پہلے مرگیا ہوتا اور ختم ہوگیا ہوتا۔ اگر کوئی کہے کہ جب آدم پیدا کئے گئے، اس وقت سے لے کر اب تک ایسا حادثہ

وتعالیٰ آدم الی الآن۔ ای الی عهد ابن الاثیر۔ لم یبتلوا بمثلها لکان صادقا ۔۔ انسانیت پر نہیں آیا تو یقیناً وہ سچا ہوگا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی (۵۹۳ - ۱۱۳۷ء) کی وفات کے ۲۰ سال سے بھی کم عرصہ میں اتنا بڑا حادثہ عالم اسلام پر کیوں پیش آیا۔ کچھ لوگ اس سلسلہ میں تاتاریوں کی سفاکی کا حوالہ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ حکمراں قومیں ہمیشہ سفاک دشمنوں کے نرغہ میں رہتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی "تاتار" مسلمانوں کے لئے ہمیشہ موجود رہا ہے۔ پھر اس کو تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں یہ شاندار کامیابی کیسے حاصل ہوئی۔ حالاں کہ یہ وہ وقت تھا جب کہ اسلامی سلطنت کی وسعت، اس کی مسلسل فتوحات، اس کی حربی اور تمدنی ترقیاں اور اس کے مقابلہ میں یورپی قوموں کی عبرتناک پسپائی نے اتنی دھاک بٹھادی تھی کہ کوئی سیاسی حوصلہ مند سلطنت اسلامی کی طرف رخ کرنے کی جرأت مشکل ہی سے کرسکتا تھا۔ تاتاری حملہ کا واقعہ ولی خلیفہ ناصر لدین اللہ (۶۲۲ - ۵۵۳ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ مشہور مورخ ابن اثیر اس خلیفہ کا ہم عصر تھا۔ وہ تاتاریوں کی خوں ریزی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

وکانوا کلما مروا بمدینة اوقریة وضعوا السیف علی اهلها دون تفرقة بین کبیر او صغیر او رجل او امراة، وعمت بلاد المشرق جرائمهم وفظائعهم	جب وہ کسی شہر یا گاؤں سے گزرتے تو اس کے باشندوں پر اپنی تیغ بے نیام کردیتے اور بڑے چھوٹے، عورت، مرد سب کو قتل کر ڈالتے۔ مشرق کے تمام علاقے ان کے جرائم سے بھر گئے۔

ابن اثیر نے ۶۱۷ (۱۲۲۰ء) کے حوادث کے ذیل میں لکھا ہے:

ان سبب خروج التتار الی الدیار الاسلامیة هو تصرف خوارزم شاه السیئ بقتل جماعة من التتار جاؤا الی بلاده للتجارة ونهب اموالهم	بلاد اسلامیہ پر تاتاریوں کی یورش کی وجہ خوارزم شاہ کی یہ بیہودہ حرکت تھی کہ اس نے تاتاریوں کی جماعت کو قتل کردیا اور ان کے اموال کو چھین لیا جو کہ اس کے ملک میں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔

یہی قصہ مختلف شکلوں میں مشہور ہوا ہے جس میں تاتاری فتنہ کی ذمہ داری خوارزم شاہ (م ۶۱۷ھ) پر ڈالی گئی ہے۔ مگر تاریخ کے گہرے مطالعہ سے یہ بات صحیح نظر نہیں آتی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خود مورخ ابن اثیر نے دوسرے موقع پر ایک اور بات لکھی ہے:

وقیل فی سبب خروجهم الی بلاد الاسلام غیر ذلك مما لا یذکر فی بطون الدفاتر: فکان ماکان مما لست اذکره فظن خیرا ولا تسال عن السبب	تاتاریوں کی یورش کا اس کے سوا دوسرا سبب بھی بیان کیا گیا ہے جس کو لکھا نہیں جا سکتا، جو ہوا وہ ہوا۔ اب میں اس کو بیان نہیں کروں گا۔ تم اچھا گمان کرلو اور سبب مت پوچھو۔ الکامل، ج ۹، صفحہ ۳۲۱

ابن اثیر کے اس بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ سیاسی اسباب سے اصل حقیقت کو چھپا رہا ہے، مگر یہ تاریخ

کی خوش قسمتی تھی کہ ابن اثیر کی زندگی ہی میں وہ سیاسی رکاوٹ ختم ہوگئی اور بعد کے "دفتر" میں وہ اس کو درج کرنے کے لئے زندہ رہا۔ تاتاری حملہ ۶۱۷ھ میں ہوا اور خلیفہ ناصرلدین اللہ کا انتقال ۶۲۲ھ میں۔ ابن اثیر نے مذکورہ بالا جملے ۶۱۷ھ کے حوادث کے ذیل میں لکھے تھے۔ ناصرلدین اللہ کے انتقال کے بعد جب وہ ۶۲۲ھ کے حوادث کے ذیل میں خلیفہ کے حالات لکھنے بیٹھا تو اس نے اپنی تاریخی کتاب میں حسب ذیل الفاظ ثبت کئے:

ان کان سبب ما ینسبه العجم الیه صحیحا من انه هو الذی اطمع التتار فی البلاد وراسلهم فی ذلک فهو الطامة الکبری التی یصغر عندها کل ذنب عظیم

اگر وہ سبب صحیح ہو جو عجمی لوگ ناصرلدین اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں یعنی وہی تھا جس نے تاتاریوں کو حملہ پر اکسایا اور اس سلسلہ میں ان کے پاس پیغام بھیجا تو وہ ایسی قیامت تھی جس کے آگے ہر بڑا گناہ ہیچ ہے۔

استاذ احمد حافظ (مؤلف کتاب الدولۃ الخوارزمیۃ والمغول) نے اس موقع پر حسب ذیل تعلیق کی ہے:

والظاهر ان ابن الاثیر وهو من المعاصرین للغزو المغولی والخلیفة الناصر لدین الله لم یجرؤ علی المجاهرة باستدعاء الخلیفة للمغول، ولم ینقل ذلک بصراحة ووضوح الا بعد ما توفی الخلیفة ذکر هذه الحقیقة فی جلاء وجراة

اس کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ ابن اثیر، جو کہ مغلوں کے حملہ اور خلیفہ ناصرلدین اللہ کے ہم زمانہ ہیں۔ خلیفہ کی وفات سے پہلے صراحتاً اس کو کہنے کی جرأت نہ کرسکے تھے کہ مغلوں کو بلانے والا خود خلیفہ ناصرلدین اللہ تھا۔ اس حقیقت کو انھوں نے خلیفہ کی وفات کے بعد جرأت اور وضاحت سے بیان کیا

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ابن اثیر کے قول کو نقل کیا ہے اور اس پر کوئی جرح وتعدیل نہیں کی (جلد ۱۳، صفحہ ۱۰۷) ابوالفداء نے اپنی تاریخ میں اس کی تائید کی ہے اور لکھا ہے:

وقد نسب الی الامام الناصر انه هو الذی کاتب التتار واطمعهم فی البلاد لیشغل خوارزم شاه عن قصد العراق

ج ۳ صفحہ ۱۳۶

خلیفہ ناصرلدین اللہ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہی ہے جس نے تاتاریوں کو لکھا اور ان کو حملہ کرنے کے لئے اکسایا تاکہ خوارزم شاہ اس کے مقابلہ میں مشغول ہوجائے اور عراق کا قصد نہ کرے

اسی طرح مقریزی نے اپنی کتاب السلوک لمعرفۃ دول الملوک میں اس کی تائید کی ہے (ج ۱، صفحہ ۲۱۸) وہ خلیفہ ناصرلدین اللہ کی وفات کے تذکرے میں لکھتا ہے

وفی خلافته خرب التتار بلاد المشرق حتی وصلوا الی همذان، وکان هو السبب فی ذلک فانه کتب الیهم بالعبور الی البلاد خوفا من السلطان علاء الدین محمد بن خوارزم شاه، لما هم بالاستیلاء علی بغداد

ناصرلدین اللہ کی خلافت کے زمانہ میں تاتاریوں نے بلاد اسلامیہ کے مشرقی علاقہ میں غارت گری کی یہاں تک کہ ہمدان تک پہنچ گئے، اس کا سبب خود یہی خلیفہ تھا، اس نے تاتاریوں کو لکھا کہ وہ بلاد اسلامیہ میں گھس آئیں۔ یہ

وان يجعلها دار مملكته كما كانت السلجوقية — اس نے سلطان علاء الدین محمد بن خوارزم شاہ کے خوف سے کیا تھا، کیونکہ وہ بغداد پر قبضہ کا ارادہ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کو اپنا دارالحکومت بنائے۔

خلیفہ ناصر لدین اللہ نے تقریباً ستر برس کی عمر پائی۔ وہ ۵۷۵ھ میں تخت پر بیٹھا اور ۴۶ سال تک حکمراں رہا آخر عمر میں اس کو شدید قسم کی پیچش ہوگئی۔ اس کی بصارت جاتی رہی اور وہ اندھا ہوگیا اور اسی حال میں رمضان ۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء) کی آخری رات کو مرگیا۔ تاتاری اپنے اس خروج میں پہلے خوارزم شاہ پر حملہ آور ہوئے اور خراسان اور بلاد جبل کو اس کے قبضہ سے چھین لیا۔ اس کے بعد چنگیز خاں (۱۲۲۷-۱۱۶۲ء) کی قیادت میں ارانیہ اور شروان پر قابض ہوگئے۔ خوارزم شاہ تاتاریوں سے شکست کھا کر طبرستان کے کسی مقام میں چلا گیا اور ۲۱ سالہ حکومت کے بعد ۶۱۷ھ میں فوت ہوگیا۔ تاتاریوں کا ایک گروہ غزنی، سجستان، کرمان وغیرہ کی طرف نکل گیا۔ خوارزم شاہ کو شکست دینے کے بعد تاتاریوں نے اس کے بیٹے جلال الدین بن خوارزم شاہ کو غزنی میں شکست دی۔ چنگیز خاں اس کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے سندھ تک چلا گیا۔ جلال الدین دریائے سندھ کو عبور کرکے ہندستان میں داخل ہوگیا۔ چند روز ہندستان میں رہ کر ۶۲۲ھ میں خوزستان اور عراق کی طرف چلا گیا اور آذربائیجان اور آرمینیا پر قابض ہوگیا۔ یہاں تک کہ مظفر کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کے بعد تاتاریوں کا ٹڈی دل ناصر لدین اللہ کی مملکت کی طرف بڑھا اور سارے عالم اسلام کو قتل وغارت گری کا قبرستان بنا ڈالا۔

ناصر لدین اللہ نے خوارزم شاہ کو نیچا دکھانے کے لئے جو تدبیر کی، وہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں عربوں نے ترک خلافت کا "جوا" اپنے سر سے اتار پھینکنے کے لئے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ بنگلہ دیش نے پاکستانی غلبہ کے خلاف اپنی لڑائی میں ایک خارجی ملک کو بہترین مددگار پایا (۱۹۷۰) افغانستان میں سردار داؤد خاں کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے وہاں کے لیڈر اشتراکی روس سے مل گئے (۱۹۷۸) وغیرہ۔ اس طرح آج بھی اکثر مسلم ممالک کسی نہ کسی "تاتاری فتنہ" کی شکار گاہ بنے ہوئے ہیں۔ اور ان نئے تاتاریوں کو جو لوگ مسلم ممالک میں داخلہ کا راستہ دے رہے ہیں وہ دوبارہ خود مسلمان ہیں جو اپنے حریف مسلمان کو شکست دینے کے لئے اغیار کو ان کے اوپر چڑھا لاتے ہیں، اس سیاست کا نتیجہ دوبارہ اسی بھیانک صورت میں نکل رہا ہے جو بارھویں صدی عیسوی میں ناصر لدین اللہ کے زمانہ میں نکلا تھا۔ اس قسم کی سیاست میں نہ صرف ملت کے بہترین امکانات برباد ہوتے ہیں بلکہ وہ دونوں فریقوں کے لئے یکساں مہلک ہے، جو لوگ اپنے مسلمان بھائی کی ضد میں اغیار کو اپنی صفوں میں داخل کرتے ہیں وہ جب آتے ہیں تو صرف ان کے مفروضہ حریف کو ختم نہیں کرتے۔ بلکہ بیرونی دراندازی کی یہ سیاست بالآخر خود ان کے لئے بھی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ وہ خود بھی بہت جلد اسی تخریبی سیاست کا شکار بن جاتے ہیں جس کا شکار وہ اپنے حریف مسلمان کو بنانا چاہتے تھے۔ بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمٰن کا قتل (۱۹۷۵) اور افغانستان کے کرنل عبدالقادر (۱۹۷۸) کی تطہیر (Purge) اس کی تازہ مثالیں ہیں۔

متحدہ محاذ کی سیاست

یہ دوسری صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے۔ لوگ بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آچکے تھے اور ہر صبح شام ایک نئی حکومت کے منتظر تھے جس کی ایک روایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی ۔ دوسری طرف ہاشمی (یا عباسی) خاندان کے کچھ لوگ بنی امیہ کے کھنڈر پر اپنی شاہی عمارت اٹھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس صورت حال نے ایک طرف عوام اور دوسری طرف عباسی حوصلہ مندوں کے لئے ایک مشترک نقطہ فراہم کردیا ——— بنی امیہ کا خاتمہ۔ اگرچہ مظلوم عوام کے لئے اس کا محرک کچھ اور تھا اور عباسی حوصلہ مندوں کے لئے کچھ اور۔ اس مشترکہ جدوجہد کے نتیجہ میں ۱۳۲ھ میں خلافت بنوامیہ کا خاتمہ ہوگیا اور سفاح تخت نشین ہوا، جو عباسیوں کا پہلا خلیفہ تھا۔ سفاح کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا۔ ۱۳۶ھ میں اس کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ بنوامیہ کے آخری زمانہ میں جو لوگ ان کے خلاف تحریک چلا رہے تھے ان میں محمد بن عبداللہ (نفس ذکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ لوگ امام حسن ابن علی کی اولاد سے تھے۔

بنوعباس جو نسلی وجوہ سے اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے اور اموی سلطنت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ جب انھیں مذکورہ بالا دونوں بھائیوں کی خفیہ تحریک کا علم ہوا تو وہ ان سے مل گئے۔ حتیٰ کہ خود المنصور (جو بعد کو خلیفہ ہوا) نے نفس زکیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اموی سلطنت ختم ہوئی اور عباسی سلطنت اس کی جگہ قائم ہوگئی۔ مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ مظالم اور زیادہ بڑھ گئے، حتیٰ کہ شاعر کو کہنا پڑا:

فمهلاً یا بنی العباس مهلاً لقد کویت بغدرکما الصدور

اے بنی عباس اپنا ظلم چھوڑ دو تمھاری غداری سے سینے داغدار ہوچکے ہیں۔

چنانچہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی دونوں روپوش ہوگئے اور جو "انقلابی تحریک" پہلے وہ بنی امیہ کے خلاف چلا رہے تھے اس کو اب بنوعباس کے خلاف چلانے لگے۔ یہاں تک کہ موقع پاکر انھوں نے خروج (سلطنت سے بغاوت) کا اعلان کردیا اور مدینہ میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ اس کے بعد ان کا جو انجام ہوا وہ یہ کہ نفس زکیہ ۱۴۵ھ میں مارے گئے اور ان کا سر منصور کے دربار میں پیش کیا گیا۔ وہی منصور جس نے ان کے ہاتھ پر نوجوانی کی عمر میں بیعت کی تھی۔

عباسی سلطنت کے قیام سے پہلے نفس زکیہ کی تحریک اور عباسی تحریک دونوں کا مشترک دشمن ایک تھا یعنی بنوامیہ۔ مگر جب عباسی تحریک نے بنوامیہ کی تحریک کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور عباسی سلطنت قائم ہوگئی تو اب صورت حال بدل گئی۔ اب عباسی سلطنت کے لئے نفس زکیہ دشمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ کیوں کہ وہ موجودہ عباسی سلطنت سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ وہی المنصور جو "انقلاب" سے پہلے نفس زکیہ کا حلیف تھا، اب ان کا دشمن بن گیا۔ اس نے ان کی تحریک کو ختم کرنے میں اتنی سرگرمی دکھائی کہ دو مہینے تک لباس نہیں بدلا اور بستر پر نہیں سویا۔ اس کو اس وقت تک چین نہیں آیا جب تک اس نے اس تحریک کو ختم نہ کرلیا۔

تاریخ کا یہ تجربہ ایک ہزار سال پہلے پیش آچکا تھا جو بتا رہا تھا کہ مختلف محرکات رکھنے والے لوگ جب کسی مقصد کے لئے متحدہ محاذ بناتے ہیں تو اس کا فائدہ ہمیشہ اس فریق کو حاصل ہوتا ہے جو زیادہ زوردار اور ہوشیار ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس تجربہ سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور لوگ بار بار اسی ناکام تجربہ کو دہراتے رہے۔

جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ - ۱۸۳۸) نے مصر میں احیائے ملت کا علم بلند کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے قوم پرستوں کی ایک انجمن الحزب الوطنی کے نام سے قائم کی جس کے ممبروں کی تعداد کافی وسیع تھی۔ اس میں شیخ محمد عبدہ، سعد زاغلول پاشا، عبداللہ نعیم بے اور احسان بے جیسے ممتاز لوگ شامل تھے۔ مصر میں جمال الدین افغانی کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ وہاں کی بااثر جماعت جمعیت ماسونیہ نے ان کو اپنا صدر نامزد کیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب جمال الدین افغانی کی انجمن کا ایک خفیہ رکن توفیق پاشا مصر کے تخت حکومت پر متمکن ہوگیا۔ اگرچہ اس کامیابی میں فرانس اور برطانیہ کا زیادہ ہاتھ تھا۔ اس واقعہ کے بعد جمال الدین افغانی اور ان کے "قوم پرست" ساتھی بہت خوش ہوئے۔ انھیں نظر آیا کہ ان کی دیرینہ آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ یہ محض سراب تھا۔ توفیق پاشا نے تخت پر بیٹھتے ہی جمال الدین افغانی اور ان کے مخصوص خادم ابوتراب کو مصر سے جلاوطنی کا حکم دے دیا۔ توفیق پاشا، سید جمال الدین افغانی کی خفیہ مجلسوں میں شریک ہو چکا تھا، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لوگ امپیریلزم کے شدید مخالف ہیں۔ چوں کہ توفیق پاشا کو انھیں امپیریلیسٹ طاقتوں (فرانس اور برطانیہ) کی حمایت سے کام کرنا تھا، اس لئے اس نے مصر میں ان کی موجودگی کو حکومت کے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ اس نے فوج اور پولس کی کڑی نگرانی میں جمال الدین افغانی اور ان کے خادم کو سوئز بھیج دیا اور وہاں انھیں بجبر کشتی پر سوار کر کے روانہ کر دیا گیا۔

عجیب بات ہے کہ صرف نصف صدی بعد اسی حصہ میں ٹھیک اسی غلطی کو دوبارہ اس سے زیادہ بری شکل میں دہرایا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جب مصر میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور فوجی افسروں نے ملک میں حکومت قائم کر لی تو ایک صاحب مجھ سے ملے۔ "مولانا...... مصر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں" انھوں نے بہت رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیوں خیریت تو ہے" میں نے پوچھا۔

"یہ جو مصر میں انقلاب ہوا ہے، بظاہر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ فوجی انقلاب ہے، مگر حقیقتاً اخوانی اس انقلاب کے ہیرو ہیں۔ اب مصر میں اخوان المسلمین کی حکومت ہوگی، مولانا اس لئے جانا چاہتے ہیں کہ اس نازک اور تاریخی موقع پر اخوانی لیڈروں کو نصیحت کریں اور اسلامی نظام کی تعمیر کے لئے انھیں مفید مشورے دیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ مصر میں جو فوجی افسر انقلاب لائے تھے ان میں ایسے بھی تھے جن کے اخوان المسلمین سے تعلقات تھے۔ وہ اخوانی تحریک کی تائید کرتے تھے۔ حتیٰ کہ خود جمال عبد الناصر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخوانیوں کے اجتماعات میں شریک ہوتے تھے۔ موجودہ صدر سادات کا بیان ہے کہ فوجی افسروں کی "انقلابی کونسل" نے ان کو مامور کیا تھا کہ وہ اخوانیوں سے رابطہ قائم کریں اور انقلابی جدوجہد کے سلسلہ میں ان کی تائید حاصل کریں۔ چنانچہ جس رات کو شاہ فاروق

کی حکومت کا تختہ الٹ گیا ہے۔ اخوانی رضا کار قاہرہ کی سڑکوں پر پہرہ دینے میں مشغول تھے۔ وہ ان خفیہ باتوں کے بھی راز دار تھے جن میں شاہ فاروق کو تخت سے معزول کرنے کی اسکیم بنائی گئی تھی۔

"جب اخوان المسلمین اور فوجی افسروں کے اشتراک سے مصر میں انقلاب آیا تھا تو کیوں ایسا ہوا کہ فوجی افسروں نے برسر اقتدار آنے کے بعد اخوانیوں کو ختم کر دیا" یہ سوال اکثر لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔ جواب بالکل سادہ ہے۔ یہ "اشتراک"، اسی قسم کی ایک غلطی تھی جس کا نمونہ اوپر کی مثالوں میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

شاہ فاروق کی فوج کے کچھ جونیر افسر فاروق کی قبر کے اوپر اپنی حکمرانی کا تخت بچھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر انھیں شبہ تھا کہ وہ تنہا اپنے اس خواب کو عملی شکل دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف اخوان المسلمین مصر میں اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی اس تمنا کو کس طرح واقعہ بنائیں۔ دونوں کی راہ کی رکاوٹ بظاہر صرف ایک چیز تھی، شاہ فاروق کی حکومت۔ اس صورت حال نے دونوں گروہوں کے لئے ایک مشترک نقطۂ اتحاد فراہم کر دیا۔ باہم ملاقاتیں اور دوستیاں شروع ہو گئیں۔ خفیہ مجالس میں شاہ کے خلاف اسکیمیں بننے لگیں۔ دونوں خوش ہو گئے کہ مقصد کے حصول کا قریبی موقع ہاتھ آگیا ہے۔ مگر جب حکومت بدلی تو فطری طور پر وہ ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو زیادہ ہوشیار اور عملی طور پر حکومت سے قریب تر تھے اور اتفاق سے یہ وہی لوگ تھے جن کو اسلامی یگانگت سے زیادہ ذاتی حوصلوں کی تکمیل کے شوق نے فریق ثانی سے قریب کیا تھا۔ انقلاب کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ ان حوصلوں کی تکمیل میں پہلے جہاں شاہ فاروق کی شخصیت حائل تھی وہاں اب یہ "قدیم دوست"، آکر کھڑے ہو گئے ہیں یا کم از کم کھڑے ہو سکتے ہیں۔ حل بہت آسان تھا۔ پہلے کے فوجی افسر اب ملک کے حکمراں بن چکے تھے۔ انھوں نے اپنے قدیم دوستوں کو اس سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ اپنی راہ سے ہٹا دیا جس کا مظاہرہ انھوں نے شاہ فاروق کی معزولی کے وقت کیا تھا۔

اسی اتحادی سیاست کو مزید بدتر شکل میں پاکستان میں دہرایا گیا ہے۔ ۱۹۵۸ میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا اور صدر ایوب کی "ڈکٹیٹر شپ"، ملک میں قائم ہو گئی۔ یہ صورت حال ملک کے بہت سے لوگوں کے لئے پریشان کن تھی۔ ان میں ایک طبقہ "اسلام پسند"، حضرات کا تھا، یہ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام لانے کے علم بردار تھے اور صدر ایوب اور ان کی "بنیادی جمہوریت"، ان کے نزدیک اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ دوسرا گروہ سیکولر اور سوشلسٹ ذہن رکھنے والوں کا تھا۔ ان کو بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ "بنیادی جمہوریت"، کے ہوتے ہوئے وہ ملک کے اقتدار پر قبضہ نہ کر سکیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کو ختم کیا جائے۔ دونوں گروہ آخری منزل کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ تاہم دونوں محسوس کرتے تھے کہ "صدر ایوب" کی ذات دونوں کے لئے یکساں رکاوٹ ہے۔ اشتراک کی اس منفی بنیاد نے دونوں کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر یکجا کر دیا۔ اور پھر دونوں نے مل کر ملک میں وہ طوفان مچایا کہ خود ملک دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ یہ متحدہ محاذ جو بڑے بڑے دعووں کے ساتھ بنایا گیا تھا جب اپنے آخری انجام کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کا سارا فائدہ سیکولرزم اور سوشلزم کے علم برداروں

کے حصہ میں آیا ہے اور اسلام پسند گروہ کو اس کے سوا کچھ نہیں ملا کہ ساری طاقت خرچ کر کے سیاست کے صحرا میں ملوما مدحورا بنے رہیں۔

اب اسی نادان سیاست کو ہندوستان کے کچھ مسلم قائدین نے اس ملک میں درآمد کیا ہے۔ وہ معاہداتی سیاست کے نعرے لگا رہے ہیں۔ الیکشن کے موقع پر وہ ایک سیاسی پارٹی سے مل کر دوسری پارٹی کو شکست دیتے ہیں۔ مگر قوم کے بے شمار وسائل کو خرچ کرنے کے بعد ان کے حصہ میں جو آخری چیز آئی ہے وہ صرف یہ کہ الکشن کے بعد جب لوگ اسمبلیوں پر قبضہ کرلیں اور وزارتیں بنالیں تو ہمارے لیڈر اسٹیج پر نمودار ہو کر یا پریس کانفرنس کر کے یہ "انکشاف" کریں کہ جیتنے والوں نے ہم سے فلاں فلاں وعدے کئے تھے جو پورے نہیں کئے گئے۔ ۱۹۶۷ کے الکشن میں معاہداتی سیاست کے رہنماؤں نے دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر ریاستوں میں حکمراں کانگریس کو شکست دی۔ ۱۹۷۷ کے الکشن میں اندرا گاندھی کی شکست کے بعد ایک مسلم رہنما نے کہا "آج ہم نے ظلم کا بیڑا غرق کر دیا"۔ مگر ان فتوحات کے باوجود اصل صورت حال آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ وہ پہلے تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی غلطی کو ہم کب تک دہراتے رہیں گے۔ اصل سیاست یہ ہے کہ خود اپنے آپ کو طاقتور اور مستحکم بنایا جائے۔ سیاسی اشتراک یا متحدہ محاذ ہمیشہ اس فریق کے لئے مفید ہوتا ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فیصلہ کن پوزیشن کا حامل ہو۔ اندرونی کمزوری اور انتشار کو درست کرنے سے پہلے متحدہ محاذ کی طرف دوڑنا نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ (اگست ۱۹۷۲)

اس سلسلہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جہاں تک جزوی امور میں تعاون کا تعلق ہے۔ اس قسم کا تعاون ہر ایک سے لیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ کافر و مشرک سے بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے نازک سفر میں عبداللہ بن اُریقط کو رہنما بنایا جو کہ مشرک تھا۔ صفوان بن امیہ آپ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ حالاں کہ اس وقت تک وہ مشرک تھے۔ امام زہری نے روایت کیا ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعان بناس من الیہود فی حربہ فاسھم لھم (رواہ سعید فی سننہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض یہودیوں سے جنگ کے موقع پر مدد لی تو ان کے لئے مال غنیمت میں حصہ مقرر کیا۔

مگر یہ جزوی اور انفرادی تعاون کی مثالیں ہیں۔ کلی جدوجہد کے سلسلہ میں کبھی اغیار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر وہ جدوجہد جو "غیر صالح حکمراں" کو ہٹا کر اس کی جگہ "صالح حکمراں" کو لانے کے لئے کی جائے۔ اس قسم کی سیاسی جدوجہد تمام تر جماعت صالحہ کی اپنی طاقت پر ہونا چاہئے۔ کوئی جماعت صالح اگر اپنے بل پر انقلاب لانے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اس کا غیر سیاسی دائرۂ عمل میں کام کرنے پر قانع رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ غیر صالح عناصر کو لے کر عملی سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ یہ غیر صالح عناصر اپنے مزاج کی بنا پر ایسا کبھی نہیں کر سکتے کہ "غیر صالح حکمراں" کو بے دخل کرنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور خالی شدہ تخت کو تمام تر جماعت صالحہ کے حوالے کر دیں۔ وہ لازماً یہ چاہیں گے کہ تخت پر خود قبضہ کریں۔ اس وقت "متحدہ محاذ" کے اندر باہمی کش مکش شروع ہوگی جو یقینی طور پر غیر صالح عناصر کے غلبہ پر ختم ہوگی۔ ساری تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے۔

جب تعمیری حوصلے سیاسی عزائم میں تبدیل ہو جائیں

ابوعلی محمد بن علی بن مقلہ (۳۲۸ - ۲۷۲ھ)
ایک غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا فن کار تھا۔ اس نے قدیم عربی خط (خط کوفی) میں اصلاحات کر کے اس کو حسین اور جامع بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ابتدا میں وہ عباسی حکومت کے ایک دفتر میں چھ دینار ماہوار پر منشی تھا۔ پھر اس کا فنی کمال اس کو خلیفہ کے دربار تک لے گیا۔ یہاں اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مسلسل تین بادشاہوں کا وزیر بنتا رہا۔ اولاً مقتدر باللہ عباسی (۳۲۰ - ۲۸۲) کا، پھر اس کے بھائی قاہر باللہ (۳۲۲ -   ) کا، اس کے بعد راضی باللہ (۳۲۹ - ۲۹۷) کا۔ واضح ہو کہ "وزیر" قدیم زمانے میں وزیر اعظم کے ہم معنی ہوتا تھا۔ کیونکہ بادشاہ کا صرف ایک وزیر ہوتا تھا اور اس کو سارے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ مقتدر باللہ کے ابتدائی زمانے میں حامد بن عباس وزیر تھا۔ اس کے ساتھ اس نے علی بن عیسیٰ الجراح کو نائب وزیر بنایا تو لوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ ایک شاعر کی نظم کا ایک شعر یہ ہے۔

اعجب من کل ما رأینا
ان وزیرین فی بلاد

سب سے عجیب بات جو ہم نے دیکھی
وہ یہ کہ ایک ملک میں دو وزیر ہیں

ابن مقلہ کے یہ مناصب اس کے فن کی ترقی میں بے حد مددگار ہو سکتے تھے۔ اگر ان ملے ہوئے مواقع کو وہ فن تحریر اور اس سلسلے کی دوسری چیزوں کی ترقی اور تحقیق میں لگاتا تو نہ صرف یہ کہ عربی رسم الخط بہت پہلے اپنے معراج کمال کو پہنچ جاتا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تحریر اور کتابت کے میدان کی بہت سی دوسری ایجادیں جو اس کے بہت بعد سامنے آئیں اسی کے زمانے میں وجود میں آگئی ہوتیں۔ مثال کے طور پر کاغذ ابن مقلہ سے آٹھ سو برس پہلے ۱۰۵ء میں چین میں ایجاد ہوا۔ اس کا ایجاد کرنے والا سائی لون تھا جو ابن مقلہ کی طرح چینی شہنشاہ ہوتی کا وزیر تھا۔ روسی ترکستان میں عربوں اور چینیوں کی جنگ میں کچھ چینی قیدی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے وہ کاغذ بنانا جانتے تھے۔ سمرقند میں ان سے کاغذ بنوایا گیا۔ اس کے بعد ۷۹۵ء میں دستی کاغذ کی صنعت بغداد میں قائم ہوئی۔ تاہم مشین کے ذریعے کاغذ بنانے کا کام پہلی بار ۱۷۵۰ء میں ہالینڈ میں کیا گیا۔ مسلسل رول کی شکل میں کاغذ بنانے کی صنعت ۱۷۹۸ء میں فرانس میں شروع ہوئی۔ اسی طرح پرنٹنگ پریس پہلی بار غالباً چینیوں نے ۷۷۰ء میں دریافت کیا۔ یہ ابن مقلہ (۹۴۰ - ۸۸۵ء) کی پیدائش سے ۱۱۵ سال پہلے کا زمانہ تھا۔ پرنٹنگ کا قدیم ترین نمونہ اس سے بھی پہلے پانچویں صدی عیسوی کا چین میں دریافت ہوا ہے۔ یورپ میں ترقی یافتہ پرنٹنگ پریس ۱۵ ویں صدی میں گوٹن برگ نے بنایا اور بائبل چھاپی۔ تاہم مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس نپولین کے ذریعے ۱۷۹۸ء میں پہلی بار مصر پہنچا۔

ابن مقلہ جو نہ صرف فن تحریر کا ماہر تھا بلکہ حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنے میدان میں لگاتا تو کاغذ اور چھپائی اور اس طرح کی دوسری نعمتیں جو عالم اسلام کو بہت بعد کو ملیں شاید ابن مقلہ کے زمانہ ہی میں اس کو مل چکی ہوتیں۔ مگر وہ اس پر قانع نہ رہ سکا کہ اپنے آپ کو مخصوص میدان میں محدود رکھے۔ وزارت کے ملے ہوئے مواقع کو وہ تحریر اور کاغذ اور چھپائی کی ترقی میں استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس اس نے ان مواقع کو عزت و ناموری کی طرف چھلانگ لگانے کے لئے ایک زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ ابن مقلہ جب وزیر کے منصب پر پہنچ گیا تو اس کے ساتھ وہی حادثہ ہوا جس سے وہ لوگ بہت کم بچتے ہیں جن کو حالات کسی بلند مقام پر پہنچا دیں۔ اس کے فنی حوصلے اب سیاسی

عزائم میں تبدیل ہو گئے۔ خاموش تعمیری کاموں میں مشغول رہنے کے بجائے وہ سیاسی اور فوجی تحریکوں کا لیڈر بن گیا اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ خلیفہ قاہر باللہ کو تخت سے اتار کر ابو احمد بن مکتفی کو عباسی سلطنت کا حکمراں بنا یا جائے۔

راز کھل گیا۔ ابن مقلہ پر یہ الزام لگا کہ اس نے فوجی سردار مونس خادم کے ساتھ مل کر قاہر باللہ کی حکومت کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔ سازش کے انکشاف کے بعد ابن مقلہ کا گھر جلوا دیا گیا۔ ابو احمد بن مکتفی کو دیوار میں چن دیا گیا تاہم ابن مقلہ کی ذہانت اس کے کام آئی۔ وہ فرار ہو کر بچ گیا اور اس کے بعد پانچ لاکھ دینار خلیفہ کو نذر کر کے دوبارہ وزارت حاصل کر لی۔ مگر اس کے سیاسی عزائم نے دوبارہ اس کے لئے مسائل پیدا کئے۔ یہاں تک کہ راضی باللہ نے اس کو وزارت سے معزول کر کے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا۔ بلاشبہ یہ ایک سخت ترین سزا تھی جو کسی فن کار کو دی جا سکتی تھی۔ گھر کی قید میں جو اشعار وہ پڑھا کرتا تھا۔ اس میں سے ایک شعر یہ تھا:

لیس بعد الیمین لذۃ عیش

یا حیاتی بانت یمینی فبینی

دایاں ہاتھ کٹ جانے کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں، اے میری زندگی جب میرا دایاں ہاتھ مجھ سے جدا ہو گیا تو تو بھی جدا ہو جا۔

ابن مقلہ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو اس نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی۔ یہاں تک کہ بائیں ہاتھ سے بھی وہ اتنا ہی اچھا لکھ لیتا تھا جیسا وہ دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ میں ایک قلم باندھا اور اس سے لکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ ہاتھ کٹنے سے پہلے کے خط اور ہاتھ کٹنے کے بعد کے خط میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باکمال انسان اپنے گھر کے قید خانے میں ۵۶ سال کی عمر میں مر گیا۔

ابن مقلہ شاعر بھی تھا۔ اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ماتم میں بہت سے اشعار موزوں کئے۔ وہ کہتا تھا: "وہ ہاتھ جس نے قرآن کے فلاں فلاں نسخے لکھے، جس نے رسول اللہ کی فلاں فلاں حدیثیں لکھیں، جس نے مشرق و مغرب میں احکام لکھ کر بھیجے وہ چوروں کے ہاتھ کی طرح کاٹ دیا گیا۔"

ماضی کے ابن مقلہ کو تاریخ معاف کر سکتی ہے، مگر حال کے "ابن مقلہ"، جو اپنے مناصب کو تعمیری جدوجہد میں نہیں لگاتے بلکہ اشتہاری قسم کے ذاتی عزائم میں اپنے قیمتی مواقع کو برباد کر رہے ہیں۔ ان کے پاس دوسری بار اس اندوہناک غلطی میں مبتلا ہونے کا کیا عذر ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بہترین صلاحیتیں ہمیشہ سیاسی عزائم میں برباد ہوئی ہیں۔ سیاست بازی کے کام میں عام طور پر وہی لوگ حصہ لیتے ہیں جو قدرت سے اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیت کو کسی تعمیری خدمت میں لگانے کے بجائے سیاسی حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار انسانی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ بے شمار اقتصادی وسائل برباد ہوتے ہیں۔ اور عملاً اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ کچھ لوگوں کو لیڈرانہ شہرت حاصل ہو جائے اور عوام کے حصہ میں صرف یہ نتیجہ آئے کہ ایک "ظالم" کی جگہ دوسرا "ظالم"، تخت سلطنت پر بیٹھ گیا ہو۔ تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے کہ مقابلہ آرائی کی سیاست سے کبھی کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہوا ہو۔ قوم کو اٹھانے کا راز یہ ہے کہ قوم کے رہنما اپنے سیاسی جھنڈے کو نیچا کر لیں۔ انفرادی حوصلوں کا "بیج"، جہاں زمین میں دفن ہوتا ہے وہیں سے قومی مستقبل کا شاندار "درخت" اگتا ہے۔ آج ہماری تاریخ کو اسی قسم کی "شہادت" کا انتظار ہے۔

سیاست کے ساتھ دینی خدمت کا کام نہیں کیا جا سکتا

شمالی نائجیریا کی ۵۰ ملین آبادی میں آدھے سے زیادہ مسلمان ہیں۔ دو سو برس پہلے کی بات ہے۔ شمالی نائجیریا کے سلطان بیوانے ریاست کے علما کو اپنے دربار میں بلایا اور ان کو تحفے دئے۔ آنے والوں میں ایک بزرگ نے تحفہ قبول نہیں کیا۔ یہ عثمان دان فودیو (۱۸۱۷ – ۱۷۵۴) تھے۔ انھوں نے کہا: میں آپ کا تحفہ اس وقت لوں گا جب کہ آپ مجھ کو تبلیغ اسلام کا پروانہ عطا فرمائیں ــــ سلطان نے فوراً ان کے مطالبہ کو مان لیا۔ عثمان دان فودیو نے اس کے بعد تبلیغ و دعوت کا کام شروع کیا۔ ان کی کوششوں سے نائجیریا کے بہت سے باشندے مسلمان ہو گئے۔

تاہم یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ عثمان دان فودیو نے اس کے بعد سلطان کے سامنے سیاسی مطالبات رکھنے شروع کئے۔ "تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرو، ٹیکس کی شرح گھٹاؤ، وغیرہ"۔ اس قسم کے مطالبات نے حکمرانوں کو خفا کر دیا۔ سلطان بیوا کسی طرح ان کو برداشت کرتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا سلطان نفاتا تخت پر بیٹھا۔ اس نے نہ صرف عثمان دان فودیو کے سیاسی مطالبات کو رد کیا بلکہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر بھی پابندی لگا دی۔ اب عثمان دان فودیو اور ان کے ساتھی سلطان کے سیاسی مخالف بن کر کھڑے ہو گئے۔ ۱۸۰۹ میں اس باہمی جنگ کا سلسلہ شروع ہوا جو عثمان دان فودیو کی موت (۱۸۱۷) تک ناکام طور پر جاری رہا۔ احمدو بلو انھیں عثمان دان فودیو کے لڑکے تھے جن کو اپنے باپ سے ایک طرف تبلیغی جذبہ کی وراثت ملی تھی اور اسی کے ساتھ سیاسی جہاد کی بھی۔ عجیب بات ہے کہ احمدو بلو نے اپنے والد کے انجام سے کوئی سبق نہیں لیا اور اسی تجربہ کو پھر دہرایا جو ان کے پیش رو کے زمانہ میں ناکام ہو چکا تھا۔

"میری کوششوں کی وجہ سے دسمبر ۱۹۶۳ سے لے کر مارچ ۱۹۶۵ تک تقریباً دو لاکھ (۱۸۶۹۳۰) مشرکوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو سماجی زندگی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں"۔

یہ نائجیریا کے سابق وزیر اعظم الحاج احمدو بلو (۱۹۶۶ — ۱۹۰۱) کے الفاظ ہیں جو انھوں نے ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴) کی موتمر اسلامی (قاہرہ) میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ افریقہ کی لگ بھگ ۲۲ کروڑ آبادی میں دس کروڑ ۸۰ لاکھ مسلمان ہیں۔

اگر مسلم ملکوں کی مدد شامل حال ہو تو افریقہ کے مشرک قبائل میں تیزی سے اسلام پھیل سکتا ہے۔ اور اس کا ثبوت خود میری وہ کامیابیاں ہیں جن کا میں نے ابھی حوالہ دیا"

احمدو بلو کو اسلام کی خدمت کا یہ جذبہ اپنے دادا عثمان ڈان فوڈیو سے ملا تھا۔ ۱۹ ویں صدی میں جب پرتگال، فرانس اور برطانیہ نے افریقہ کے علاقوں میں گھسنا شروع کیا تو افریقہ میں اس کے رد عمل کے تحت بہت سے مصلحین اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھیں میں سے ایک عثمان ڈان فوڈیو بھی تھے۔ انھوں نے گزشتہ صدی میں مسلمانوں کی اصلاح اور استعماری طاقتوں کے خلاف جہاد کی زبردست تحریک چلائی۔ دریائے نائجیریا کے کنارے کنارے دور تک انھوں نے اسلام کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔ ۱۸۳۳ میں ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے

یہ مہم جاری رکھی۔ نائجیریا کی راجدھانی لاگوس سے لے
کر شمال میں لکوتو شہر تک مقابلے جاری تھے۔ تاہم آخری
فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا۔ انھوں نے ۱۸۸۶ میں
سلطان محمد طاہر اور ان کے ساتھیوں کو شکست دے کر
نائجیریا پر قبضہ کر لیا۔

احمد و بلو انھیں روایات کے درمیان موجودہ
صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ سوکوتو کے
امیر قبیلہ تھے۔ ابھی وہ دس سال کے تھے کہ باپ کا
انتقال ہو گیا۔ ان کی ماں ایک دیندار خاتون تھیں۔
قدیم رواج کے مطابق پہلے انھیں قرآن حفظ کرایا گیا۔
اس کے بعد انھوں نے عربی مدرسہ میں داخلہ لیا اور ۲۱
سال کی عمر تک دینی تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ ۱۹۲۶
میں مغربی تعلیم کے لئے کاسینا کالج میں داخل ہوئے اور
انگریزی زبان اور ریاضیات کی تعلیم مکمل کی۔ خاندانی
وراثت کے تحت ان کو سکوتو کا امیر بنایا گیا۔ ۱۹۳۴ میں
سلطان حسن نے ان کو شہر رباح کا گورنر مقرر کیا۔

۱۹۳۸ میں جب سلطان حسن کا انتقال ہوا تو نئے سلطان
ابوبکر نے احمد و بلو کو سوکوتو کے "ساردونا" کے منصب
پر سرفراز کیا۔ ۱۹۴۸ میں انھوں نے لندن کا سفر کیا اور
آزادی کے مسائل پر حکومت برطانیہ سے گفتگو کی۔

۱۹۶۳ کی مردم شماری کے مطابق نائجیریا میں
۳۰ ملین مسلمان ہیں، عیسائی ۱۹ ملین اور دوسرے
قبائل ۱۰ ملین ہیں۔ شمالی نائجیریا میں زیادہ تر مسلمان
آباد ہیں اور جنوبی نائجیریا میں زیادہ تر عیسائی۔ احمد بلو
شمالی نائجیریا کے لیڈر تھے۔ وہ مغربی استعمار کے خلاف
جنگ میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۶۰ میں نائجیریا آزاد ہوا تو وہاں
ایک فیڈرل گورنمنٹ بنی۔ اس حکومت کے فیڈرل پرائم منسٹر
سر ابوبکر تفاوا بلیوا (۱۹۱۲-۱۹۶۶) تھے۔ احمد و بلو
شمالی نائجیریا کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ یہ ایک مخلوط
حکومت تھی جس میں مختلف پارٹیوں کے نمائندے اور
اور مسلمان اور عیسائی دونوں شریک تھے۔ احمد بلو
نے مسلمانوں کی اصلاح و تعمیر اور عیسائیوں میں اسلام
کی اشاعت کا کام پوری توجہ سے شروع کیا۔ اس کے
نتائج بھی نکلنے شروع ہوئے۔ مگر انھیں زیادہ کام کرنے
کا موقع نہیں ملا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۶۶ کو ۲۵ فوجی افسروں
نے مل کر بغاوت کر دی۔ اس بغاوت میں ابوبکر تفاوا بلیوا
احمد و بلو اور بہت سے مسلمان اور عیسائی مارے گئے۔
اس کے بعد نائجیریا میں فوجی حکومت قائم ہو گئی جس کے
سربراہ جنرل ارونسی تھے۔ مگر انھیں بھی صرف چھ ماہ
حکومت کرنے کا موقع ملا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۶۶ کو دوسری
فوجی بغاوت ہوئی اور وہ بھی ختم کر دیئے گئے۔

نائجیریا میں دو مسئلے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد
ستر فی صد ہے۔ مگر تعلیم، اقتصادیات اور تنظیم میں پیچھے
ہونے کی وجہ سے عملاً اکثر شعبوں پر عیسائی چھائے ہوئے ہیں۔
ضرورت ہے کہ انھیں تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے بلند
کیا جائے تاکہ وہ ملک میں اپنا جائز مقام پا سکیں۔ دوسرا
کام یہاں کے عیسائیوں اور خاص طور پر ۱۰ ملین مشرک قبائل
میں اسلام کی اشاعت ہے۔ یہ دونوں کام احمد و بلو نے
شروع کر دیئے تھے۔ مگر ان کی شہادت سے جو سبق ملتا ہے
وہ یہ کہ تعمیر و تبلیغ کا کام سیاست کو لے کر نہیں کیا جا سکتا
احمد و بلو اگر سیاست سے الگ ہو کر یہ کام کر رہے ہوتے تو
وہ ۲۰-۲۵ برس میں نائجیریا کی تاریخ بدل دیتے۔ مگر سیاست
کے خارزار نے انھیں بھی ختم کر دیا اور ان کے ملی اور اسلامی
کام کو بھی ☐

سیاسی حرص کے بجائے سیاسی قناعت

کوئی مرد عورت اپنی اولاد کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہی سیاست کا معاملہ بھی ہے کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے پیدا کردہ سیاسی حالات کے منطقی نتائج سے انکار کر سکے۔ ایسی ہر کوشش ہمیشہ الٹی پڑتی ہے اور صرف محرومیوں میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اس کو پاکستان کی مثال سے سمجھئے۔

پاکستان تقسیم کے نعرہ پر بنا مسلمانوں کی طرف سے "ڈائرکٹ ایکشن" کی نوبت آجانے کے بعد بالآخر یہ تحریک کامیاب ہوئی اور فریق ثانی نے اس مطالبہ کو مان لیا کہ آبادی کی بنیاد پر ملک کو تقسیم کر دیا جائے۔ مگر ۱۹۴۷ میں جب تقسیم کی سرحدیں طے کرنے کا وقت آیا تو پاکستانی لیڈروں کو نظر آیا کہ تقسیم کے اصول کے مطابق "جوناگڑھ" اور "حیدرآباد" جیسی مسلم ریاستیں ان کے ہاتھ سے نکل رہی ہیں۔ اب انھوں نے کوشش کی کہ دیسی ریاستوں کے معاملہ میں الحاق کے اصول کو مبہم رکھا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ بیک وقت کشمیر پر بھی قبضہ کر لیں گے اور حیدرآباد پر بھی۔ کشمیر کو اس دلیل سے کہ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، حیدرآباد کو اس لئے کہ وہاں کا حکمراں مسلمان ہے۔ مگر یہ خود اپنے پیدا کردہ حالات کے منطقی نتائج سے انکار کرنا تھا۔ چنانچہ اس کا انجام الٹا ہوا۔ دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑنے کی کوشش میں پاکستان ایک کو بھی نہ پکڑ سکا۔

پاکستان بنا تو وہ دو ایسے الگ الگ حصوں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک (مشرقی حصہ) واضح طور پر دوسرے کے مقابلہ میں عددی اکثریت رکھتا تھا۔ بنگالی لیڈر حسین شہید سہروردی کی کوششوں سے پاکستان کے سابقہ دونوں حصوں میں سیاسی مساوات (Parity) قائم ہوگئی۔ صدر ایوب خاں کی بنیادی جمہوریت میں یہ مساوات ایک مسلمہ سیاسی اصول کے طور پر باقی رہی۔ اس کے مطابق مشرقی حصہ کے چالیس ہزار اور مغربی حصہ کے چالیس ہزار نمائندہ ووٹر ملک کی حکومت کا فیصلہ کرتے تھے۔ مگر پاکستان کے رہنما اس نظام کے خلاف ہوگئے۔ انھیں صدر ایوب کو اقتدار سے ہٹانا تھا اور اس کی سب سے آسان تدبیر یہ تھی کہ عوام کو یہ کہہ کر ان کے خلاف بھڑکا دیا جائے کہ بنیادی جمہوریت قائم کرکے انھوں نے عوام کے سیاسی حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ اب پاکستان میں تحریک جمہوریت چلائی گئی۔ بے پناہ نقصانات کے بعد بالآخر تحریک کامیاب ہوئی۔ صدر ایوب اور ان کی بنیادی جمہوریت دونوں ختم ہوگئے۔

۱۹۷۰ میں پاکستان کا پہلا عوامی انتخاب ہوا جس میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی آبادی چونکہ زیادہ تھی، اس کے نمائندوں کی تعداد مرکزی اسمبلی میں زیادہ (۵۵ فی صد) ہوگئی۔ مساوات ٹوٹ گئی اور بنگلہ دیش نے پاکستان کے اوپر سیاسی بالاتری حاصل کرلی۔

اب پاکستان کے رہنما چیخ اٹھے۔ انھوں نے جمہوریت کے فتنہ کو یہ سمجھ کر جگایا تھا کہ وہ خود ان کو اقتدار تک پہنچانے کا زینہ بنے گی نہ اس لئے کہ بنگلہ دیش کے سیکولر لیڈر اس کا استعمال کرکے پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جائیں گے۔ انھوں نے چاہا کہ جمہوریت کو دوبارہ "پابند جمہوریت" بنائیں اور مشرقی اور مغربی حصہ میں مساویانہ نمائندگی

کا اصول قائم کریں جیسا کہ وہ پہلے قائم تھا۔ مگر عوامی جمہوریت کو زندہ کرنے کے بعد اس قسم کی کوشش خود اپنے پیدا کردہ حالات کے نتائج سے بھاگنے کے ہم معنی تھا۔ بنگلہ دیش عوامی رائے دہی کے اصول کے تحت ملی ہوئی سیاسی فوقیت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ جمہوری منطق کے تحت پیدا شدہ نتائج کے انکار نے نئے شدید تر مسائل پیدا کئے۔ دونوں حصوں میں کش مکش بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ نوبت آئی کہ خود پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔

۱۹۷۸ میں یہ تجربہ اب ایک نئی شکل میں دہرایا جا رہا ہے۔ پاکستان کے دوسرے عوامی انتخاب (۱۹۷۷) میں بھٹو پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی۔ حزب مخالف کے لئے یہ سیاسی محرومی ناقابل برداشت تھی۔ اس نے الکشن کے نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے نعرہ لگایا کہ بھٹو پارٹی دھاندلی کرکے الکشن جیتی ہے۔ ورنہ پاکستانی عوام کی ننانوے فی صد اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔ انھوں نے "دوبارہ الکشن کراؤ" کے نام پر پاکستانی شہروں میں ہنگامے شروع کر دیئے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر فوجی افسروں نے بغاوت کر دی اور حکومت پر قبضہ کر لیا۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ صرف ریفری کے طور پر حکومت کے ایوان میں داخل ہوئے ہیں اور بہت جلد منصفانہ الکشن کرائے جائیں گے۔

پاکستان قومی اتحاد کے لیڈر خوش ہو گئے اور ۱۹۷۷ کو "عام الفتح" قرار دیا۔ مگر بھٹو پارٹی کے جلسوں میں عوام کی بھیڑ نے بتایا کہ بھٹو کے بے اقتدار ہونے کے باوجود عوام اب بھی اسی کے ساتھ ہیں اور اگر الکشن ہوا تو بھٹو پارٹی ہی دوبارہ برسر اقتدار آجائے گی۔ جس جمہوریت کو لانے کے لئے پاکستانی رہنماؤں نے چوتھائی صدی خرچ کر دی تھی وہ جب آئی تو معلوم ہوا کہ وہ ساری کی ساری "بھٹو" جیسے لوگوں کے حصہ میں چلی گئی ہے۔ ان کو محسوس ہوا کہ مسئلہ صرف جمہوری انتخابات کا نہیں ہے بلکہ "مسئلہ انتخابات کی پیش آمدہ مصیبت اور ان کے متوقع بھیانک نتائج کا بھی ہے"۔ اب انھوں نے اپنے نعرے بدل دیئے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "جمہوریت کو جلا ڈالو۔ لوگوں کی آزادیاں سلب کر لو۔ عمر کا کوڑا حرکت میں لاؤ" (المنبر، فیصل آباد ۳ راکتوبر ۱۹۷۸) یہی پاکستان کے تمام مخالف بھٹو رہنماؤں کا ذہن ہے۔ کوئی اس بات کو بھدے الفاظ میں کہہ رہا ہے اور کوئی خوبصورت الفاظ میں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی سیاست خود اپنے پیدا کردہ حالات کے نتائج کو قبول نہ کرنا ہے۔ جب پاکستان میں عوامی جمہوریت کو زندہ کیا گیا ہے تو اب یہ ممکن نہیں کہ اس کے منطقی نتائج کو ظہور میں آنے سے روکا جا سکے۔ پاکستانی رہنماؤں کی یہ سیاست بلاشبہ ان کے لئے نہایت مہنگی پڑے گی۔ "نظام مصطفیٰ" اور "نظریہ پاکستان" جیسے الفاظ بول کر اس سیلاب کو روکا نہیں جا سکتا۔

اس قسم کی غلطی بار بار کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ "سیاسی حرص" ہے۔ ہمارے رہنما صرف اتنے پر قانع ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں جو حقیقی حالات کے اعتبار سے انھیں مل سکتا ہے۔ ان کی اس کمزوری نے انھیں غیر حقیقت پسند بنا دیا ہے۔ وہ ایسے اقدامات کرتے ہیں جن کو نبھانے کی طاقت ان میں نہیں ہوتی۔ اسلامی تعلیم کے مطابق اگر وہ حرص کے بجائے قناعت کا طریقہ اختیار کریں تو وہ زیادہ بڑی اور حقیقی کامیابی حاصل کریں اور قوم کو بھی نئے نئے مسائل سے دوچار کرنے کی ذمہ داری سے بچ جائیں۔ (۲۳ راکتوبر ۱۹۷۸)

تاریخ کا ایک سبق

ترکی مشرق و مغرب کا سنگم ہے اس لیے مغربی تہذیب سے تصادم کا مسئلہ سب سے پہلے یہیں پیش آیا ۔ مگر اس کے جواب میں کیا ہوا۔ ایک طرف قدیم علماء کا گروہ تھا جو مغرب کی طرف سے آنے والی ہر چیز کا اس درجہ مخالف تھا کہ سلطان سلیم ثالث (۱۸۰۷ - ۱۷۸۹) اور اس کے جانشین سلطان محمود (۱۸۳۹ - ۱۸۰۸) کی نئی فوجی تنظیمات اور ان جدید اصلاحات تک کی مخالفت کی جو انھوں نے ترکی کو عسکری اور علمی لحاظ سے یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے دوش بدوش لے چلنے کے لیے نافذ کی تھیں۔

دوسری طرف ترکی کی وہ نئی نسل تھی جو پیرس اور برلن اور لندن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے آئی تھی، وہ ترکی کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینا چاہتی تھی۔ ان کی انتہا پسندی کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے مغربی تقلید کے جواز کے لیے ایک پورا فلسفہ بنا ڈالا۔ ضیاء گوک الپ نے کہا:

"مغربی تہذیب درحقیقت بحر روم کی تہذیب کا امتداد ہے، اس تہذیب (جس کو ہم بحیرہ روم کے منطقہ کی تہذیب کہتے ہیں) کے بانی سماری، سیتھی، فنیقی، رعاۃ، ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

تاریخ میں قدیم زمانوں سے پہلے ایک طورانی دور کا وجود ملتا ہے، اس لیے کہ وسط ایشیا کے قدیم باشندے ہمارے اجداد تھے۔ اس کے بعد مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا، پھر مغربی و مشرقی سلطنت روما کے خاتمہ کے بعد ترکوں نے یورپ کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا، اور اسی بنیاد پر ہم مغربی تہذیب کا جزو ہیں اور ہمارا اس میں حصہ ہے۔"

ان کا منتہائے فکر یہ تھا کہ "وہ اپنے دماغ سے کام لے کر اپنے کو مغرب کی روشن اور بلند پایہ تہذیب میں جذب کر لیں" (عرفان اورگا، اتاترک، ۲۹۷) کمال اتاترک (۱۹۳۸ - ۱۸۸۱) جب ۱۹۲۴ میں ترک جمہوریہ کے پہلے صدر مقرر ہوئے تو ان کے نزدیک جو سب سے اہم کام تھا وہ یہ کہ ترکوں کو مغرب کا لباس پہنا دیں۔ انھوں نے پردہ کو خلاف قانون قرار دیا۔ عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف جاری کیے عربی میں اذان ممنوع ہو گئی۔ ہیٹ کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔ حتی کہ جب ایک خوں ریز انقلاب کے بعد ہیٹ کی جنگ جیت لی گئی تو مصطفے کمال نے مکہ کی موتمر اسلامی (۱۹۲۶) میں شرکت کے لیے ترک پارلیمنٹ کے ایک ممبر ادیب ثروت کو اس حال میں روانہ کیا کہ وہ اس کے واحد مندوب تھے جو اپنے سر پر مغربی ہیٹ رکھے ہوئے تھے۔ یہ گویا ترکی کی فتح عظیم کا اعلان تھا۔

یہی مثال ہر مسلم ملک میں پیش آئی ہے۔ ان میں ڈگری کا فرق تو ہو سکتا ہے مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ ہر جگہ یہی ہوا کہ قدیم مذہبی طبقہ نے مغرب سے نفرت اور اجتناب میں زندگی کا راز بتایا اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے مغرب کی تقلید سے یہ امید کی کہ وہ دوبارہ بام عروج پر پہنچ جائیں گے۔ مگر یہ مثال کہیں نظر نہیں آتی کہ کچھ لوگ شدت سے اس پہلو کی طرف قوم کو متوجہ کر رہے ہوں کہ قوت و طاقت کے اس راز کو معلوم کرو جس سے مسلح ہو کر مغرب تمہارے اوپر اور دنیا کے اوپر چھا رہا ہے

ترکی کی یہ تاریخ ایک انتہائی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلم ممالک کس طرح حالات کا اندازہ کرنے میں ناکام رہے اور نتیجۃً وقت کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ اسی کے ساتھ ترکی کی تاریخ میں دو اور علامتی مثالیں بھی ہیں۔ ملی کام کے لئے جاندار کارکنوں کا نہ ملنا، اور تیاری کے بغیر اقدامات۔

جدید ترکی میں دو شخصیتیں علمی و فکری حیثیت سے انتہائی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک نامق کمال (۱۸۸۸-۱۸۴۰) دوسرے ضیا گوک الپ (۱۹۲۴-۱۸۷۵) دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دونوں ترکی کے علاوہ عربی اور فرنچ زبانیں جانتے تھے۔ انیسویں صدی کی مسلم دنیا کی دوسری تمام شخصیتوں کی طرح اگرچہ یہ دونوں ہی سیاست سے متاثر تھے۔ اور سیاسی انقلاب کو سب سے بڑا کام سمجھتے تھے۔ تاہم دونوں میں یہ فرق تھا کہ نامق کمال نسبتاً معتدل اور متوازن فکر کے آدمی تھے۔ وہ عملی سیاست سے متاثر ہونے کے باوجود اسلامی اصطلاحوں میں سوچتے تھے اور "ترک اتحاد" کے بجائے "اسلامی اتحاد" کے الفاظ بولتے تھے۔ مزید یہ کہ نامق کمال کو ترکی کی جدید نسل میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ خالدہ ادیب خانم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> "نامق کمال ترکی جدید کی محبوب ترین شخصیت تھی۔ ترکی کے افکار و سیاسیات کی تاریخ میں ان سے زیادہ کسی دوسری شخصیت کی پرستش نہیں کی گئی"

Halde Edib, *Turkey Faces West*, p. 84

دوسری طرف ضیا گوک الپ ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کے فکری نظام میں اسلام بنیادی عامل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے دعوت دی کہ ترکی کی تعمیر نو خالص قومی اور مادی بنیادوں پر کی جائے۔ وہ اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب کا پرجوش علم بردار تھا۔

ترکی کی بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ترکی میں نامق کمال جیسے لوگوں کے افکار کو غلبہ نہیں ملا۔ بلکہ ضیا گوک الپ جیسے لوگ عملاً وہاں کی سیاست و قیادت پر چھا گئے۔ اس کی کم از کم ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ضیا گوک الپ کے افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کمال اتاترک (۱۹۲۴-۱۸۸۱) جیسا طاقتور اور مضبوط ارادہ کا آدمی مل گیا تھا۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے۔ نامق کمال نے اگرچہ اپنی قوم کے ایک طبقہ میں محبوبیت حاصل کی۔ تاہم اپنے خطیبانہ ادب میں وہ جن خیالات کو پیش کر رہے تھے، ان کے اندر روایتی لوگوں کے لئے خواہ کتنی ہی اپیل ہو، جدید افکار کے عالمی سیلاب میں اس کی حیثیت ایک قسم کے رومانی خواب کی تھی۔ اصولی طور پر بلاشبہ یہ بات درست ہے کہ اسلام کو اجتماعی اداروں کی بنیاد ہونا چاہئے۔ مگر ایک ایسی دنیا میں جہاں عملی طور پر سیکولر افکار کا غلبہ ہو، کوئی شخص اپنا علیحدہ جزیرہ تعمیر نہیں کر سکتا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ عمومی فکری فضا کو اس کے موافق بنا لیا جائے۔

جدوجہد نام ہے اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کرنے کا

ہندستان میں مغربی قوموں کے لئے داخلہ کا راستہ سب سے پہلے واسکوڈی گاما (۱۴۶۰-۱۵۲۴) نے پیدا کیا۔ اس کے بعد پرتگالی اور فرانسیسی قومیں اس ملک کے ساحلی علاقوں میں داخل ہوئیں۔ آخر میں انگریز آئے اور ڈیڑھ سو برس کے اندر انھوں نے پورے برصغیر پر قبضہ کر لیا۔ ہند، پاکستان، بنگلہ دیش، سیلون، برما، تبت نیپال، سب انگریز کے جھنڈے کے نیچے آ گئے۔ ہندستان پر اپنے قبضہ کو دائمی بنانے کے لئے انھوں نے نہر سوئز پر قبضہ کیا اور اس کے بیشتر حصے مہنگی قیمت پر خرید لئے۔

انگریزوں نے نہ صرف ہندستان کی سیاست اور معیشت پر قبضہ کیا بلکہ یہاں کی سرکاری زبان بدل دی۔ تعلیمی نظام ایسا بنایا جس سے ایسی نسل پیدا ہو جو لارڈ میکالے کے الفاظ میں "پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی اور خیالات کے اعتبار سے انگریز ہو"۔ عیسائی مشنریوں نے حکومت کی مدد سے مسلح ہو کر پورے ملک کو عیسائی بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح ایک ایسی حکومت جس کی وسعت اتنی زیادہ تھی کہ "اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا" اپنے تمام وسائل اور تہذیبی طاقت کے ساتھ ملک کے اوپر چھا گئی اور اپنے اقتدار کو مستقل بنانے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو اس مادی دنیا میں اور وہ بھی آج کے ترقی یافتہ دور میں کوئی کر سکتا ہے۔

مگر اگست ۱۹۴۷ کا انقلاب بتاتا ہے کہ بات وہیں ختم نہیں ہو جاتی جہاں کوئی اپنے طور پر اسے ختم سمجھ لیتا ہے۔ کوئی قوم خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر دوسری قوم کے اوپر غالب آ جائے، پھر بھی کچھ ایسے گوشے باقی رہتے ہیں جہاں سے جدوجہد کر کے دبی ہوئی قوم دوبارہ نئی زندگی حاصل کرے۔ پھر اس انقلاب ہی کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ یہ کام محض جھنجھلاہٹ کے ساتھ سر ٹکرانے سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ حالات کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے اور حریف کے اس نازک گوشہ کو تلاش کیا جائے جہاں سے مؤثر جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے —— خدا نے اپنی دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں ہر بار گرنے کے بعد اس کے بندوں کے لئے دوبارہ ابھرنے کا ایک نیا امکان باقی رہے۔ مگر یہ امکان اسی کے لئے واقعہ بنتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی اسکیم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو اپنی خود ساختہ راہوں پر دوڑنا شروع کر دے، اس کے لئے خدا کی اس دنیا میں ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

گھڑی کی سوئی بظاہر جہاں سب سے زیادہ قریب نظر آتی ہے وہ اس کا شیشہ ہے۔ لیکن گھڑی کی سوئی گھمانے کے لئے کوئی شخص اس کے شیشہ پر زور آزمائی نہیں کرتا بلکہ اس کی چابی پر اپنا ہاتھ لے جاتا ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمارے تمام لیڈر "گھڑی" کے شیشہ پر زور آزمائی کر رہے ہیں۔ خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ سوئی تو نہ گھومے البتہ غلط طریق عمل کی وجہ سے مسائل میں کچھ اور اضافہ ہو جائے۔

تاریخ، انسانی تجربات کا مجموعہ ہے، ناکام تجربہ بھی اور کامیاب تجربہ بھی۔ تاریخ، انسانی نسل کے ماضی کا ریکارڈ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ آدمی کو اِس قابل بناتا ہے کہ وہ پچھلی غلطیوں کو نہ دہرائے اور زیادہ درست انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN 978-81-7898-724-8



₹ 25.00